ماہنامہ

پیغامِ حق

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کے افکار عقائد اور پیغام کا علمبردار

مرتبہ

غلام سرور فگار

دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ٦ آنے

قیمت سالانہ چار روپے

پیکو کے عکسی مترجم قرآن مجید

قسم پنجم

کے پانچ پاروں کی تیسری جلد بھی مکمل ہو کر زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے عربی
متن کے مقابل کے صفحہ پر بامحاورہ سلیس اُردو ترجمہ اور حاشیہ پر ہر
رکوع کا خلاصہ عام فہم زبان میں عکسی بلاکوں سے شایع کیا گیا ہے کاغذ
عُمدہ چھپائی صاف اور دیدہ زیب جلد مضبوط اور خوبصورت حجم ۲۷۰ صفحے
باوجود ان تمام خوبیوں کے ہدیہ اس قدر کم رکھا گیا ہے۔ کہ ہر
خاص و عام اس سے مستفید ہو سکے۔

اپنے شہر کے کسی تاجر یا ہمارے ایجنٹ سے ۸عہ میں حاصل کیجئے

پیکو لمیٹڈ بیرون موچی دروازہ لاہور

قیمت سالانہ

عوام سے چار روپے　　　　رؤسا سے پانچ روپے

فہرست مضامین

جلد ۵	اکتوبر ۱۹۴۱ء	عدد ۴

سید محمد شاہ پرنٹر پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع کرا کر دفتر رسالہ "پیغام حق"

ظفر منزل تاج پورہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

اگست و ستمبر کا پرچہ پیغام حق کی ایک اشاعت خاص تھا جس میں ضابطہ ازدواج پر پوری پوری بحث کی گئی تھی۔ اس زمانہ میں جبکہ اسلامی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں، عوام کا تو کیا پوچھنا، خواص تک ان الجھنوں کو نہیں سلجھا سکتے جو یورپین طرز تمدن و طرز فکر اور ہندوستانی ماحول کی وجہ سے مسلمانوں کیلئے انتشار اور پریشانی کا باعث بن رہی ہیں۔ اسلام نے ازدواجی زندگی کو خوشگوار اور تمدن کا بہترین نمونہ بنانے کیلئے جو قوانین وضع کئے تھے وہ کچھ تو غیر مسلموں کے سیاسی استیلاء اور کچھ مسلمانوں کی اپنی غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے ذہنوں سے حرف غلط کی طرح مٹ گئے ہیں اب اگر کسی بندۂ حق کو ان قوانین کے معلوم کرنے کی ضرورت درپیش آتی بھی ہے تو وہ بیچارا باوجود تلاش و تجسس کے ناکام رہتا ہے۔ خدا بھلا کرے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا جنہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اسلامی ازدواجی زندگی کے تمام شرعی قوانین تحریر فرما دیئے اور ان دنوں جو مسائل مہمہ مثلاً انفساخ نکاح اور تبدیل مذہب اور ستم ناروا کی جو صورتیں درپیش ہیں ان کا بہترین حل سجھا دیا۔

جن حضرات نے پیغام حق کی اس اشاعت کا مطالعہ کیا ہے وہ ہماری اس کوشش سے بہت متاثر ہوئے ہیں کئی ایک نے ہماری حوصلہ افزائی کی ہے اور اسی طرز کے مضامین جن سے مسلمانوں کی عملی زندگیوں کو کوئی فائدہ پہنچ سکے شائع کرنے کی سفارش کی ہے۔

ہمارے خیال میں بھی اس دور میں جبکہ مسلمان از سر نو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی آرزو کرنے لگا ہے اسے ایسا ہی لٹریچر پڑھنا چاہئے مگر افسوس تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو اس طرز کا لٹریچر پڑھتے ہیں ان کا شمار قوم میں ایسا ہی ہے جیسے آٹے میں نمک بلکہ اس سے بھی بہت کم کیونکہ آٹا تو نمک سے متاثر ہو جاتا ہے مگر یہ لوگ کسی سے متاثر نہیں ہوتے۔

پیغام حق کا اگلا پرچہ "قرآن نمبر" ہوگا۔ یہ پرچہ نومبر اور دسمبر کا مشترکہ پرچہ ہوگا جو دسمبر کے پہلے ہفتہ میں انشاء اللہ العزیز

نکال دیا جائیگا۔ اس پرچے کیلئے ایسے ایسے نادر اور مفید مضامین حاصل کئے گئے ہیں کہ اُن کے مطالعہ سے قارئین کرام یقیناً معتدبہ فائدہ اُٹھائینگے۔ اس پرچہ میں مولانا عبداللہ العمادی مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا عبیداللہ صاحب سندھی جیسے فاضل علمار کے مضامین ہوں گے اوران کے علاوہ بھی بہت سے ایسے حضرات کے مضامین درج ہوں گے جن کو قرآن کریم کے ساتھ ایک گونہ شیفتگی اور والہانہ محبت کا تعلق ہے۔

رسائل وکتب کا مطالعہ کرنے والے حضرات سے یہ امر اب کس طرح مخفی نہیں کہ کاغذ کی قیمت اب پہلے کی نسبت تین گنا زائد ہے۔ کاغذ کا ایک رم جو ہم چار ساڑھے چار روپے میں لیا کرتے تھے اب ساڑھے تیرہ روپے میں ملتا ہے۔ کاغذ کی اس گرانی کے باعث کچھ رسائل اخبارات بند ہو گئے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو چراغ سحری بنے بیٹھے ہیں۔ یہ ادارہ حکیم الامت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کی یادگار کے طور پر قائم کیا گیا تھا اور اس کا مقصد وحید صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ایسے اسلامی لٹریچر کی اشاعت کی جائے جو مسلمانوں کے سیاسی اور مذہبی امور کو نقطۂ اعتدال پر لائے۔ اُن کے اندر غیرت وحمیتِ اسلامی کا جوش پیدا کرے اور اُنہیں قرآنِ کریم کی یہ نصیحت ہمیشہ یاد دلاتا ہے کہ لَا تَمُوتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ اب ایسے ادارہ کو زندہ رکھنا ہم دو چار آدمیوں ہی کا فرض نہیں ہے بلکہ پوری قوم کا فرض ہے اس سے قبل بھی دو تین مرتبہ قارئین کرام کی توجہ اِس طرف مبذول کرائی گئی تھی مگر بہت کم توجہ دی گئی ہے اب مجبوراً ذرا تلخ نوائی سے کام لینا پڑا ہے۔ جو قوم اپنے قومی لٹریچر کو زندہ نہیں رکھ سکتی اُس کی موت یقینی ہے۔ آپ یہ عذر نہیں کرسکتے کہ آپ کو لٹریچر زندہ رکھنے کے دسائل حاصل نہیں۔ دور نہ جائیے صرف پیغامِ حق کے خریداروں میں ایسے ایسے متمول اور صاحبِ اقتدار سینکڑوں حضرات موجود ہیں جو اگر چاہیں تو اُن میں سے ایک ایک اس قابل ہے کہ ادارے کے پورے اخراجات دس پندرہ سال کے لئے بیک وقت ادا کرسکے مگر حالت یہ ہے کہ تین روپے سالانہ چندہ سے زائد ایک دمڑی تک وہ حضرات بطور معاونت نہیں دیتے یہ چندہ اس قدر کم ہے کہ رسالے کے اخراجات پہلے ہی پورے نہیں ہو رہے تھے اور اب جبکہ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے اخراجات سہ گنا ہوگئے ہیں وہ کیسے پورے ہونگے۔ ان حالات کے پیش نظر آپ حضرات سے درخواست ہے کہ اقبال اکیڈیمی اور رسالہ پیغام حق کی معاونت کی طرف توجہ کیجئے۔

رسالہ کا چندہ اس پرچہ سے بجائے تین روپے کے چار روپے کیا جارہا ہے امید ہے کہ آپ حضرات بخوشی اسے قبول کر لینگے۔ چار روپے سالانہ کے معنی ہیں ساڑھے پانچ آنے ماہانہ اگر آپ ساڑھے پانچ آنے ماہانہ ایسے اسلامی لٹریچر کے لئے خرچ کریں گے تو آپ یقین رکھئے کہ آپ کا کچھ نقصان نہیں ہوگا ہاں قوم کی تعمیر میں آپنے جو معاونت کی ہے اُس کے اجر کے آپ ضرور مستحق ہو جائیں گے۔

ادارہ کی معاونت کی ایک شکل یہ ہے کہ رسالہ کی توسیع اشاعت میں ہماری مدد کیجئے اگر آپ تمام حضرات صرف ایک ایک ہی خریدار اپنے اثر سے بنا دیں تو بھی اشاعت دو چند ہو سکتی ہے حالانکہ بعض حضرات اگر توجہ کریں تو کئی کئی خریدار بآسانی دے سکتے ہیں۔

ہمارا معاونت کی دوسری صورت یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے مارچ ۱۹۴۷ء کے پیغام حق میں لکھا تھا آپ اقبال اکیڈیمی کی رکنیت قبول فرمائیے جس کے شرائط حسب ذیل ہیں۔

محسن خاص:۔ جو حضرات کم از کم دو سو روپیہ یک مشت عنایت فرمائیں گے وہ اقبال اکیڈیمی کے محسن خاص متصور ہونگے۔ ایسے ہمدردانِ اسلام کی خدمت میں اکیڈیمی کی تمام مطبوعات معہ رسالہ بلاقیمت نذر کی جاتی رہیں گی نیز اکیڈیمی کے کارکن اُن کے قیمتی مشوروں پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

۲۔ محسنین:۔ جو حضرات کم از کم ایک سو روپیہ یک مشت عنایت فرمائیں گے وہ اکیڈیمی کے محسنین کہلائیں گے اس عطیہ کے پیش نظر اُن کی خدمت میں اقبال اکیڈیمی کی جملہ مطبوعات نصف قیمت پر اور رسالہ بلاقیمت روانہ کیا جاتا رہے گا۔

۳۔ معاونین:۔ جو حضرات کم از کم پندرہ روپے سالانہ مرحمت فرمائیں گے وہ معاونین کہلائیں گے۔ اُن کی خدمت میں اقبال اکیڈیمی کی طرف سے کم از کم چار مطبوعات نصف قیمت پر اور رسالہ بلاقیمت روانہ کیا جائیگا۔

۴۔ احباء:۔ جو حضرات دس روپے سالانہ مرحمت فرمائیں گے اُن کا شمار اقبال اکیڈیمی کے احباء میں ہوگا۔ ان کی خدمت میں رسالہ بلاقیمت اور اقبال اکیڈیمی کی کم از کم دو مطبوعات نصف قیمت پر روانہ کی جائیں گی۔

مجھے امید ہے کہ جن حضرات کے دل میں احساس ہے جو اس ادارہ کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں جن کے نزدیک صالح لٹریچر کی کوئی اہمیت ہے وہ حتی الامکان امداد و اعانت سے گریز نہیں کریں گے۔

نقد و نظر

فتنۂ رہبانیت :- از جناب مرزا عزیز فیضانی دارا پوری -

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ضخامت ۲۶۴ صفحات - کاغذ عمدہ سفید سرورق مضبوط رنگین - کتابت و طباعت نفیس قیمت مجلد عہ غیر مجلد عمر

کتاب ملنے کا پتہ :- مرزا خالد بیگ مینجر مکتبۂ دارابی - فیضانی منزل - اسلامیہ پارک جنوبی لاہور

فتنہ رہبانیت کے مصنف جناب مرزا عزیز فیضانی اُن قابلِ ذکر ہستیوں میں سے ہیں جن کو ہم ہمیشہ وقعت کی نظر سے دیکھتے چلے آئے ہیں اور جن کے ساتھ ہماری بہت سی علمی مذہبی امیدیں وابستہ ہیں - ناظرین "پیغام حق" مرزا صاحب ممدوح کے مفید مضامین رسالہ ہذا میں اکثر پڑھ چکے ہیں - آپ اعلٰی درجہ کے اسلامی شاعر اور قابل ادیب ہونے کے علاوہ معتدل مزاج مذہبی محقق ہیں آپ کی کئی ایک مفید تصانیف مثلاً فتنہ رسوات - فن تفسیر - فضیلت مصطفٰےؐ عوام خواص میں خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں - فتنہ رہبانیت آپ کی ایک نئی تصنیف ہے جس میں "ترک دنیا" کے غلط نظریہ کی تردید نہایت احسن طریق پر کی گئی ہے - مصنف نے کتاب کی تدوین میں بڑی جانفشانی اور وسعت نظر سے کام لیا ہے - ترتیب مضامین کے لحاظ سے یہ کتاب اپنے موضوع میں ایک خاص اور ممتاز درجہ رکھتی ہے - مسائل کی بحث مفصل ہونے کے علاوہ تدریجی ہے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے عوام و خواص غرضیکہ ہر طرح کے مخاطبین کی ذہنی قابلیت کو پیشِ نظر رکھا ہے -

اس موضوع پر ایک مفصّل کتاب کی شدید ضرورت مدت مدید سے محسوس ہو رہی تھی - الحمد للہ کہ مرزا صاحب نے نہایت دل نشین طریق پر سادہ اردو زبان میں اس ضرورت کو بوجہ اتم پورا کر دیا ہے - کتاب کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) تعارف و تمہید (۲) اثرات رہبانیت ، (۳) دنیا داری کے اسلامی احکام ان ہر سہ حصص کے ماتحت جو چھوٹے چھوٹے عنوانات تجویز کئے ہیں - وہ بجائے خود نہایت جامع ہیں - ان عنوانات کے ماتحت سینکڑوں

علمی و مذہبی مباحث آ گئے ہیں ہم نے کتاب کو بنظر غائر دیکھا ہے۔ اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ قابل مصنف نے کوئی بحث تشنہ و نامکمل نہیں چھوڑی سرتاج صوفیائے کرام حضرت مولانا جلال الدینؒ رومی کے اس

شعر ؎ چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

کی مفصل۔ مدلل۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں جامع تشریح دیکھنی مطلوب ہو تو اس کتاب کو دیکھ لیا جائے ترک دنیا کے قطعی غلط۔ غیر اسلامی نظریہ کی جس طرح تردید اس کتاب میں کی گئی ہے شاید ہی کہیں ہو۔

اس زمانہ پُر فتن میں جبکہ قرآن و حدیث سے بہت زیادہ بے اعتنائی برتی جا رہی ہے عوام کا تو کیا ذکر خواص بھی بدعات سیئہ کا شکار ہیں۔ اُن کا گمان ہے۔ کہ شریعت و طریقت جدا جدا ہیں۔ ترک دنیا جو در اصل عیسائیت و یدانت کے عہد ناپوسی کی یادگار ہے اسی خیال کے نتیجہ میں بعض غال اور جاہل صوفیوں کی بدولت دین اسلام میں زبردستی ٹھونس دی گئی تھی۔ مصنف نے پردہ چاک کر کے اسلام کی اصل صورت دکھائی ہے۔ اسلام ایک کامل مذہب ہے۔ انسانی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی۔ اس کو دوسروں کے دروازہ پر لیجانا پرلے درجہ کی بے غیرتی ہے

کتاب ہر لحاظ سے قابل مطالعہ ہے۔ نو تعلیم یافتہ۔ علماء۔ صوفی۔ عوام و خواص۔ سب کے کام کی ہے ناظرین پیغام حق سے گذارش ہے۔ کہ اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر میں اس کتاب کی ترویج کر کے خود مستفید ہوں اور مصنف کی حوصلہ افزائی کریں۔

گو آیات قرآنی اور احادیث کی کتابت میں کسی کسی جگہ غلطیاں پائی گئی ہیں اور بعض احادیث بلا حوالہ درج کر دی گئی ہیں۔ حالانکہ حوالہ جات مزید لطف کا باعث ہو سکتے تھے۔ مگر ایسی باتیں باوجود کوشش و محنت رہ ہی جایا کرتی ہیں ہم ایک دفعہ اور "فتنہ رہبانیت" ایسی اعلےٰ درجہ کی کتاب کے گہرے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

ادبیات

جنگ اور امن

(از خواجہ فیض لدھیانوی ۔ لاہور)

(۱) جنگ

جنگ سے دشمن تباہ — جنگ آزادی کی راہ
جنگ آئینِ حیات — جنگ پر فطرت گواہ
جنگ تب و تابِ دل — جنگ پروازِ نگاہ
جنگ جانِ مردمی — جنگ شانِ انتباہ
جنگ سے عزت ملے — جنگ سے حاصل ہو جاہ
جنگ میں لڑنا ثواب — جنگ سے ڈرنا گناہ
جنگ کے دوران میں — جنگ ہے جائے پناہ
جنگ اتمامِ ہنر — جنگ تکمیلِ سپاہ
جنگ ہے خوف و خطر — جنگ ہے دیوِ سیاہ
جنگ کا ارمان رکھ — جنگ کا میدان چاہ
جنگ ہے تقدیرِ قوم — جنگ ہے تدبیرِ شاہ
جنگ ہے فیضِ خودی
جنگ ہے تحسین و واہ

(۲) امن

امن غلامی کا دام — امن سے قومیں غلام
امن ہے عشرت کی مے — امن ہے مستی کا جام
امن ہے خوابِ گراں — امن ہے مرگِ دوام
امن قبروں کا مکیں — امن مُردوں کا امام
امن کا احساس پست — امن کی اُمید خام
امن سے کمزور فوج — امن سے برہم نظام
امن ہے کس چیز میں؟ — امن ہے کس شے کا نام؟
امن سے نالاں سحر — امن سے بیزار شام!
امن جمود و سکوت — امن قرار و قیام
امن سازِ باکمال — امن سوزِ ناتمام
امن ہے نیلم پری — امن ہے رقص و خرام
امن ہے بزمِ سخن
امن ہے فیضِ کلام

بندۂ مومن

(از جناب عزالدین صاحب پال امرتسر)

سکندرانہ ادائیں، قلندرانہ نماز
نیازمندیاں تیری کہ بارگاہ میں ناز
ترا وہ راہِ محبّت میں مضطرب رہنا
تری وہ جلوت و خلوت، ترا وہ سوز و گداز
تری نگاہ سے دو نیم یہ جہاں سارا
تری نگاہ سے ہر قلب میں نشیب و فراز
تری نگاہ سے تقدیر بھی بدل جائے
ترے اثر سے ہر اک ذرّہ مائلِ پرواز
تری نظر کا یہ فیضان ہے کہ کرگس بھی
فضا میں اپنی اڑانوں پہ کر رہا ہے ناز

اقبال اور انسان

(غلام سرور فگار)

انسان کیا ہے ؟

اس کو کیوں پیدا کیا گیا ؟

اس کی زندگی کا کیا مقصد ہے ؟

یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب ہر زمانہ کے نبی اور اصحابِ غور و فکر دیتے رہے ہیں اور تمام مذہبوں اور فرقوں کی توسیع اور استحکام کا دارومدار بھی انہیں سوالات کی وضاحت پر ہے

جہاں تک تاریخ مذاہب رہنمائی کرتی ہے ہم ہندوستان، ایران اور یونان کے قدیم پیغمبروں اور ارباب فکر کے اُن خیالات کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو انہوں نے ان سوالات کی بابت ظاہر کئے۔

ہندوستان | ہندوستان کی تہذیب دنیا میں سب سے قدیم مانی گئی ہے قدیم آریاؤں کے یہاں انسان مادہ اور روح کے مجموعہ کا نام تھا لیکن اصلی چیز روح تھی جو جسم میں عارضی طور پر قیام پذیر تھی اور جس طرح کوئی شخص پرانے کپڑے اُتار کر نئے پہن لیتا ہے اُن کے خیال کے مطابق یہ روح بھی ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے قالب کو اختیار کرتی ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ فلاں کام میں نے کیا ہے وہ غلطی پر ہے عقلمند آدمی وہی ہے جو دیکھنے، سننے، سونگھنے، بولنے، چھونے اور ہاتھوں سے کام کرنے کے باوجود یہ کہے کہ میں تو کچھ نہیں کر رہا ان فعلوں کے ذمہ دار حواس ہیں

یہ ہندوستان کے انسان کی حقیقت تھی !

رہا یہ کہ اس کو کیوں پیدا کیا گیا؟ اپنے کرموں کا پھل بھوگنے کے لئے اس لئے جب تک وہ اس دنیا میں رہے گا چار و ناچار اس کی روح کو وہ تمام تکلیفات برداشت کرنی پڑیں گی جن کا تعلق اس کی جسمانی جائے سکونت سے ہے۔

انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ نروان حاصل کرے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ شادی اور غمی، تکلیف اور آرام، خوف اور غصہ، محبت اور نفرت، کامیابی اور ناکامیابی، نفع اور نقصان، نیکی اور بدی غرضکہ ہر قسم کے احساسات سے مبرا رہے اور کسی قسم کے اثر کو قبول نہ کرے کیونکہ یہ تمام احساسات گناہ کی ترغیب دیتے ہیں نیز جب تک اس دنیا میں رہے بیوی، بچوں اور دوستوں سے اپنے تعلقات منقطع رکھے کیونکہ یہ روح کی نجات کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ ترک دنیا سے زیادہ مؤثر کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے جس سے نروان کے حصول میں مدد مل سکتی ہے اور نروان کا مطلب یہ ہے کہ روح تزکیہ کرنے کے بعد برہما یا شیو کی ذات میں مل جائے چنانچہ اس غرض سے برہما اور شیو کے بتوں کی پرستش کی جاتی ہے

ایران: ایران میں بدی اور نیکی کی دو علیحدہ علیحدہ طاقتیں تصور کی گئی تھیں جن کو وہ زبان لامحدود کے دو بیٹے سمجھتے تھے ان میں سے ایک نور تھا اور دوسرا ظلمت۔ انسان ان کے ہاتھوں میں ایک کھلونے کی حیثیت رکھتا تھا۔ دراصل مقابلہ ان دونوں بیٹوں کے درمیان ہوتا تھا لیکن وہ آلۂ کار انسان کو بناتے تھے کبھی ظلمت پر نور غالب آجاتا تھا اور کبھی نور پر ظلمت۔

انسان کو اس لئے دنیا میں پیدا کیا گیا کہ وہ ظلمت کو مغلوب کرے اور اپنے نور کو آہستہ آہستہ اسی آفتاب کے ساتھ ملا دے جس کی ایرانی پرستش کیا کرتے تھے۔

دنیا کی بابت اُن کا خیال بھی ہندوؤں کی طرح یہ تھا کہ یہ شیطان کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اس لئے اس کی دلچسپیوں میں دل کو پھنسانا نہیں چاہئے بلکہ رہبانیت اختیار کرنی چاہئے اور یہی انسان کی زندگی

کا مقصد ہے۔

یونان | ہندوستان اور یونان کے معتقدات میں بہت کم فرق دکھائی دیتا ہے وجود کے وہ بھی منکر تھے اور ہوش و حواس کو کالعدم سمجھتے تھے اُن کے نزدیک مرنے سے پہلے ہی مر جانے میں زندگی تھی۔ روح اصل اور جسم بیکار اس لئے دنیا کو ترک کرکے خلوت نشینی میں عمر گزارنے کی تلقین کرتے تھے اور نجات کے لئے بتوں کی پرستش عام تھی۔

حکیم افلاطون ان تعلیمات کا بانی تھا۔ یہ تعلیمات اتنی عام تھیں کہ شعراء تک اسی رنگ میں اشعار کہتے ہیں سفوکلیس کے نوحہ کا ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔

"بہترین آرزو یہ ہے کہ انسان دنیا میں نہ آئے اور اگر آچکا ہے تو سب سے بہتر یہ ہے کہ انسان جہاں سے آیا ہے جتنی جلدی ہوسکے واپس جانے کی کوشش کرے"

انسان کی حقیقت، اس کی پیدائش کی وجہ اور اس کی زندگی کے مقصد کی وضاحت میں دنیا کی فضا جن خیالات سے معمور تھی اُوپر اس کا خاکہ پیش کیا گیا ہے ہندوستان، ایران اور یونان کے معتقدات میں سوائے جزوی اختلاف کے روح ایک ہی ہے تاریخ اس کا منبع و ماخذ ہندوستان کو ہی قرار دیتی ہے۔ بدھ کے زمانہ میں جب ہندوستان کی حکومت بھی اس مجدد کی روحانی تعلیمات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر چکی تھی تو مغربی علاقہ کے آریہ ایران اور افغانستان کی سرحدوں کو توڑ کر ان ملکوں میں داخل ہو گئے نیز بدھ مت نے اپنے پانچ سو سالہ اقتدار کے دوران میں ایران اور یونان میں اپنے مشنری بھی بھیجے تھے جن کا مقصد اس کے عقائد کا پرچار تھا انسان کی بابت یہ تصور تھوڑے سے مزید ردّو بدل کے بعد ایک عرصہ تک ایران اور یونان میں قائم رہا۔

لیکن آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل عرب میں ایک پیغمبر آیا جس نے انسان کی عظمت و برتری اور

اس کے اعلیٰ ترین نصب العین کا پیغام خدا کی جانب سے تمام دنیا کے انسانوں کو دیا اس نے بتایا کہ خدا نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے اور یہ وہ صورت ہے جو در حقیقت خدا کے نائب کے عین شایان شان ہے۔ اس کی پیدائش کی غرض بھی یہی ہے کہ وہ دنیا میں خلافتِ کبریٰ کو قائم کرے اور اس کی عنان سیادت اپنے ہاتھوں میں سنبھالے یہ تمام دنیا اسی کے لئے پیدا کی گئی ہے پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اسی کے تابع فرمان ہے جو حدود مقرر کردی گئی ہیں اُن کے اندر رہ کر وہ ان اشیاء پر حکومت کرسکتا ہے اور اُن سے کام لے سکتا ہے۔

انسان دنیا کی تمام مخلوقات سے اشرف ہے اس لئے اسے سوائے خالقِ حقیقی کے کسی کے سامنے اپنے سر کو خم نہیں کرنا چاہئے۔

یہ تھا وہ پیغام جو پیغمبر عربی صلعم نے دنیا کو دیا۔

ساڑھے تیرہ سو سال کے اندر مسلمانوں نے اندرونی اور بیرونی اختلافات کی وجہ سے اس پیغام کو جو انسان کی زندگی اور اس کے مستقبل کو درخشاں اور شاندار بناتا تھا پسِ پشت ڈال دیا اور اس کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے جتنا تباہ کن ہوا اس کا زندہ ثبوت آج خود مسلمان ہیں اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

اقبال رح نے مسلمانوں کے اِس زوال کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے جب تاریخ اسلام پر نظر ڈالی تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ مسلمانوں نے انسانیت کے اُس پیغام کو فراموش کردیا ہے جو آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل اُن کے ہادیٔ برحق حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کے نہ صرف گوش گذار کیا تھا بلکہ اپنے آپ کو اس کا عملی ثبوت پیش کیا تھا اور وہ عملی ثبوت کیا تھا؟ اقبال نے ذیل کے شعر میں واضح کیا ہے ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اور آنحضرت صلعم کے بعد جب تک صحابہ کرامؓ اور خلفاء اُن کے اس اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے

رہے خدا اور دنیا کے لوگوں کے نزدیک اُن کی برگزیدگی مسلّم رہی لیکن جب سے مسلمانوں نے عظمت انسانی کے احساس کو بھلا دیا ہے دین اور دنیا دونوں سے محروم ہو گئے ہیں۔

اس مجموعۂ اشعار میں جو "اقبالؒ اور انسان" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے اقبالؒ نے عظمتِ انسانی کے اُسی بھولے ہوئے پیغام کی یاد کو تازہ کیا ہے اور اس انداز سے اس پیغام کو پیش کیا ہے کہ فطرت کے باریک حجاب میں سے فرشتوں کے پوشیدہ تبسّم بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن پہلے کوئی ایسا کامل انسان بھی تو ہو جس کی جستجو میں خدا خود جذبۂ نیازمندی سے بیقرار ہو کر باہر نکل کھڑا ہو۔

یہ ہے اقبالؒ کا وہ شاندار انسانی تصور۔ اقبالؒ خود ایسے انسان کی جستجو میں سرگرداں رہے بالآخر انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں اس چیز کو پالیا۔ اور اُن کے مقابلہ میں دنیا کی کسی ہستی کو نہیں لاتے تھے بلکہ یہاں تک کہہ گئے ہیں ؎

می توانی منکرِ یزداں شدن

منکرِ شانِ نبی نتواں شدن

پھر بھی جس انسان میں اُن کو انسانی عظمت کی جھلک دکھائی دی خواہ وہ نپولین ہو لینن ہو یا قیصر ولیم اقبالؒ اس کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے۔

اُمید ہے کہ یہ چند سطور اِن اشعار کے مفہوم کو سمجھنے میں قارئین کرام کو مدد دیں گی۔

انسان

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے!

انسان کو راز جو بنایا راز اس کی نگاہ سے چھپایا

بیتاب ہے ذوق آگہی کا کھلتا نہیں بھید زندگی کا

حیرت آغاز و انتہا ہے

آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

ہے گرم خرام موج دریا دریا سوئے بحر جادہ پیما

بادل کو ہوا اڑا رہی ہے شانوں پہ اٹھائے لا رہی ہے

تارے مست شراب تقدیر زندانِ فلک میں پا بہ زنجیر

خورشید، وہ عابد سحر خیز لانے والا پیام "برخیز"

مغرب کی پہاڑیوں میں چھپ کر پیتا ہے مئے شفق کا ساغر

لذت گیر وجود ہر شے سرمستِ مئے نمود ہر شے

کوئی نہیں غمگسارِ انساں!

کیا تلخ ہے روزگارِ انساں!

(بانگِ درا)

انسان اور بزمِ قدرت!

صبح خورشیدِ درخشاں کو جو دیکھا میں نے
بزمِ معمورۂ ہستی سے یہ پوچھا میں نے

پرتوِ مہر کے دم سے ہے اُجالا تیرا
سیمِ سیّال ہے پانی ترے دریاؤں کا

مہر نے نور کا زیور تجھے پہنایا ہے
تیری محفل کو اسی شمع نے چمکایا ہے

گل و گلزار ترے خُلد کی تصویریں ہیں
یہ سبھی سورۂ "والشمس" کی تفسیریں ہیں

سرخ پوشاک ہے پھولوں کی، درختوں کی ہری
تیری محفل میں کوئی سبز، کوئی لال پری

ہے ترے خیمۂ گردوں کی طلائی جھالر
بدلیاں لال سی آتی ہیں اُفق پر جو نظر

کیا بھلی لگتی ہے آنکھوں کو شفق کی لالی
مئے گلرنگ خُمِ شام میں تو نے ڈالی

رتبہ تیرا ہے بڑا، شان بڑی ہے تیری
پردۂ نور میں مستور ہے ہر شے تیری

صبح اک گیت سراپا ہے تری سطوت کا
زیرِ خورشید نشاں تک بھی نہیں ظلمت کا

میں بھی آباد ہوں اس نور کی بستی میں مگر
جل گیا پھر مری تقدیر کا اختر کیونکر؟

نور سے دُور ہوں ظلمت میں گرفتار ہوں میں
کیوں سیہ روز، سیہ بخت، سیہ کار ہوں میں

میں یہ کہتا تھا کہ آواز کہیں سے آئی
بامِ گردوں سے یا صحنِ زمیں سے آئی

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود
باغباں ہے تیری ہستی پئے گلزارِ وجود

انجمن حسن کی ہے تُو، تری تصویر ہوں میں
عشق کا تو ہے صحیفہ، تری تفسیر ہوں میں

میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے
بار جو مجھ سے نہ اُٹھا وہ اٹھایا تو نے

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی — اسی خیال میں راتیں گذار دیں میں نے
ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں — سکھایا مسئلہ گردشِ زمیں میں نے
کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پہ — لگا کے آئینۂ عقل دُوربیں میں نے
کیا اسیر شعاعوں کو برقِ مضطر کو — بنا دی غیرتِ جنّت یہ سرزمیں میں نے
مگر خبر نہ ملی آہ! رازِ ہستی کی — کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں میں نے

ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

(بانگِ درا)

انسان

منظر چمنستان کے زیبا ہوں کہ نازیبا — محرومِ عمل نرگس مجبورِ تماشا ہے
رفتار کی لذّت کا احساس نہیں اس کو — فطرت ہی صنوبر کی محرومِ تمنّا ہے
تسلیم کی خُوگر ہے جو چیز ہے دنیا کی — انسان کی ہر قوت سرگرم تقاضا ہے
اس ذرّہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم — یہ ذرّہ نہیں شاید سمٹا ہوا دریا ہے

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے!

(بانگ درا)

سرگزشتِ آدم!

سُنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے — بھلایا قصّۂ پیمانِ اوّلیں میں نے

لگی نہ مری طبیعت ریاضِ جنت میں — پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے
رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو — دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے
ملا مزاج تغیّر پسند کچھ ایسا — کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے
نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی — کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے
کبھی میں ذوقِ تکلّم میں طور پر پہنچا — چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے
کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا — کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے
کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں — دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے
سنایا ہند میں آ کر سرودِ ربّانی — پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں میں نے
دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی — بسایا خطۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے
بنایا ذرّوں کی ترکیب سے کبھی عالم — خلافِ معنیٔ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے
لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو — جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے
نورِ خورشید کی محتاج ہے ہستی میری — اور بے منّتِ خورشید چمک ہے تیری
ہو نہ خورشید تو ویراں ہو گلستاں میرا — منزلِ عیش کی جا نام ہو زنداں میرا
آہ! اے رازِ عیاں کے نہ سمجھنے والے — حلقۂ دامِ تمنّا میں الجھنے والے؟
ہائے غفلت! کہ تری آنکھ ہے پابندِ مجاز — ناز زیبا تھا تجھے، تو ہے مگر گرمِ نیاز

تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر نہ سیہ کار رہے

(بانگِ درا)

انسان اور عالمِ آب و گل

عالمِ آب و خاک و باد! سرِ عیاں ہے تو کہ میں ؟
وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ ہیں ؟
وہ شب درد و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے
اُس کی سحر ہے تو کہ میں ؟ اُس کی اذاں ہے تو کہ میں ؟
کس کی نمود کے لئے شام و سحر ہیں گرم سیر
شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تو کہ میں ؟
تو کفِ خاک و بے بصر! میں کفِ خاک و خود نگر!
کشتِ وجود کے لئے آب رواں ہے تو کہ میں ؟

(بالِ جبریل)

زمانۂ حاضر کا انسان

عشق نا پید و خرد می گزدش صورتِ مار
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں گذر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلہ، نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

(ضربِ کلیم)

مردِ بزرگ

اس کی نفرت بھی عمیق، اس کی محبت بھی عمیق
قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں!
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق

انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

مثلِ خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانہ سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

(ضربِ کلیم)

حضرتِ انسان

جہاں میں دانش و بینش کی ہے اس درجہ ارزانی
کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی

کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا
نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسمہائے پنہانی

یہ دنیا دعوتِ دیدار ہے فرزندِ آدم کو
کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عریانی

یہی فرزندِ آدم ہے کہ جس کے اشکِ خونیں سے
کیا ہے حضرتِ یزداں نے دریاؤں کو طوفانی

فلک کو کیا خبر یہ خاکداں کس کا نشیمن ہے!
غرض انجم سے ہے کس کے شبستاں کی نگہبانی
اگر مقصودِ کُل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے؟
مرے ہنگامہ ہائے نو بہ نو کی انتہا کیا ہے؟

(ارمغانِ حجاز)

غزل

این جہاں چیست؟ صنم خانۂ پندارِ من است
جلوۂ اُو گرو دیدۂ بیدارِ من است

ہمہ آفاق کہ گیرم بہ نگاہے اُو را
حلقۂ ہست کہ از گردشِ پرکارِ من است

ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ ما
چہ زماں و چہ مکاں شوخیٔ افکارِ من است

از فسوں کاریٔ دل، سیر و سکوں، غیب و حضور
این کہ غماز و کشایندۂ اسرارِ من است

آں جہانے کہ درو کاشتہ را می دروند
نور و نارش ہمہ از سبحہ و زنّارِ من است

سازِ تقدیرم و صد نغمۂ پنہاں دارم
ہر کجا زخمۂ اندیشہ رسد تارِ من است

اے من از فیض تو پایندہ! نشانِ تو کجاست
این دو گیتی اثرِ ماست، جہانِ تو کجاست

(از زبورِ عجم)

غزل

ما از خدا گم شدہ ایم اُو بجستجو است
چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزو است

گاہے بہ برگِ لالہ نویسد پیامِ خویش
گاہے درونِ سینۂ مرغاں بہ ہاو ہواست

در نرگس آرمید کہ بیند جمالِ ما
چنداں کرشمہ داں کہ نگاہش بہ گفتگو است

آہے سحر گہے کہ زند در فراقِ ما
بیروں و اندروں زبر و زیر و چار سو است

ہنگامہ بست از پے دیدارِ خاکیے
نظارہ را بہانہ تماشائے رنگ و بو است

پنہاں بہ ذرہ ذرہ و ناآشنا ہنوز
پیدا چو ماہتاب و بآغوشِ کاخ و کو است

در خاکدانِ ما گہرِ زندگی گم است
ایں گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست

(از زبورِ عجم)

میلادِ آدم

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

آرزو بیخبر از خویش بآغوشِ حیات
چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

(پیامِ مشرق)

محاورہ مابین خدا و انسان

خدا

جہاں را ز یک آب و گل آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم
تو شمشیر و تیغ و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

انسان

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

——————— (پیام مشرق)

اقبال اور ٹیگور کا مقابلہ

(از جناب عبد المجید صاحب سالک ایڈیٹر اخبار "انقلاب" لاہور)

ڈاکٹر ٹیگور بھی رخصت ہوئے۔ ان کی شاعری میں زندگی کی نوا "نرم خیز" تھی۔ وہ رنگ و آہنگ موسیقی و رقص کے دلدادہ تھے۔ باغوں کے کنج۔ پھولوں سے لدے ہوئے شاخسار۔ پرندوں کے چہچہے۔ دریاؤں کی روانی۔ پہاڑی ندیوں کے گیت ان کی شاعری کا سرمایہ تھے۔ بنگالے کی خوش چشم گیسوؤں والیاں پنگھٹ پر گاگریں بھرتی تھیں تو شاعر کا دل رومان سے لبریز ہو جاتا تھا۔ آغاز میں اس کا عشق خالص مجازی تھا جو عمر کے تقاضے سے حقیقت و معرفت کی فضاؤں میں پرواز کرنے لگا۔

اس کے نزدیک انسانی زندگی کے عیش و سرور کا انتہائی تصور یہ تھا کہ چاندنی رات ہو۔ کسی خاموش ندی کے شفاف پانی پر ایک نازک سا بجرا نسیم کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے ہلکورے لے رہا ہو۔ اس بجرے میں ایک بنگالی حسینہ شاعر کے زانو پر سر رکھے ستار کے تاروں کو نہایت نزاکت سے چھیڑ رہی ہو۔ شاعر ہلکے سُروں میں گا رہا ہو۔ اور بجرا ندی کے بہاؤ کے رُخ بہتا ہوا افق کی طرف چلا جا رہا ہو اور برابر چلا جا رہا ہو!۔

یہ تصور کتنا دلفریب و دلکش ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ مقصود حیات اس قدر معمولی ہے جو ذرا سے اہتمام کے بعد حاصل ہو سکے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی صرف گانے بجانے۔ چومنے اور پیار کرنے ہی کا نام ہے۔ زندگی حقیقت میں اس سے بہت مختلف اور اس سے بہت زیادہ شدید چیز ہے۔ ٹیگور کی ندی کے مقابلے میں اقبال کا دریا بہت زیادہ پُر شور ہے اور اس کے نزدیک دریا کا مصرف بھی اس ندی

سے بہت مختلف ہے۔

اقبالؔ کے تصور پر غور کرو سہ

میا را بزم بر ساحل کہ آنجا نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و باموجش در آویز حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

رومان اور حقیقت دو مختلف چیزیں ہیں۔ ٹیگور کے کلام میں رومان کی وہ افراط ہے کہ حقیقت کی کہیں کہیں صرف جھلک سی نظر آتی ہے لیکن اقبال کے ہاں حقیقت کا اس قدر وفور ہے کہ رومان ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔

ٹیگور سب سے پہلے بھی شاعر تھے اور ہمارے نزدیک سب سے آخر میں بھی شاعر ہی تھے۔ ان کی یونیورسٹی ان کی اصلاح معاشرت۔ ان کی سیاست سب عارضی اور گریزاں چیزیں تھیں۔ ان کا شعر کسی حالت میں اپنی دلاویزی۔ اپنی رومانیت اور نسوانیت سے الگ نہ ہو سکتا تھا۔

لیکن اقبالؔ سب سے اول بھی مُعلّم اور سب سے آخر بھی مُعلّم تھے۔ ان کی شاعری اول سے آخر تک فرد اور ملّت کو زندگی کے حقائق سمجھاتی ہے اور دنیا میں رہنے کے قابل بناتی ہے۔

لیکن جب دل و دماغ دنیا کی کشمکشِ سود و زیاں سے تھکے ہوئے ہوں۔ جب زندگی کی جدوجہد کی یکسانی سے قوائے عمل میں آرام کی خواہش پیدا ہو رہی ہو۔ جب زندگی کی شاہراہ حوادث کے آفتاب کی تمازت سے اس طرح تپ رہی ہو کہ مسافر کو کسی سایہ دار درخت کے نیچے سستانے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آئے تو ٹیگور کا کلام ایک ہلکی سی شراب بلکہ "معجون فلک سیر" کا کام دے کر تھکے ماندے اعصاب کو کچھ دیر کے لئے سکون بخش سکتا ہے۔

مثنوی "اسرار خودی" کا مقدمہ

(از جناب چھوٹے لال صاحب)

مثنوی "اسرار خودی" ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ اُس کے شائع ہونے کے بعد ہی مشہور مستشرق ڈاکٹر نکلسن نے مصنف سے اُس کے ترجمے کی اجازت حاصل کی مگر ترجمہ فاضل مستشرق کی دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے ۱۹۲۰ء سے قبل شائع نہ ہو سکا۔

مثنوی جس فلسفے کی حامل ہے اُس کا استخراج اور استنباط خود مثنوی سے، اُس کی شاعرانہ حیثیت کی وجہ سے، نسبتاً مشکل تھا اور خصوصاً مغربی دماغوں کے لئے اور بھی دشوار تھا۔ چنانچہ فاضل مترجم نے اقبال کی اس فلسفیانہ مثنوی کو یورپ میں روشناس کرانے کے لئے خود مصنف سے ہی اس کی تشریح کی استدعا کی۔ انہوں نے اپنے نظریۂ خودی پر جو اُن کی مثنوی کی بنیاد ہے ایک مختصر مگر جامع مقدمہ وقتی طور پر لکھ دیا۔ ڈاکٹر نکلسن نے اُس کو بجنسہٖ اپنے مختصر مقدمے میں شامل کر دیا ہے۔ ذیل میں اقبال کے اسی انگریزی مقدمہ کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے اُن کا اردو مقدمہ جو اس مثنوی کی پہلی اشاعت میں شامل ہے اور یہ انگریزی مقدمہ دونوں مل کر مثنوی "اسرار خودی" کے فلسفیانہ پس منظر کو سمجھنے کے لئے غالباً مفید ہوں۔

نکلسن کی رائے میں اقبال ایک مذہبی فلسفی یا متکلم ہیں۔ وہ جس طرح مشرقی خیالات کے ماہر ہیں اُسی طرح مغربی علوم کے بھی متبحر نقاد ہیں۔ وہ اپنے فلسفیانہ خیالات میں نٹشے اور برگسان سے متاثر ہیں، انہوں نے اُن سے صحیح استفادہ کر کے اپنا مستقل نظام فلسفہ پیش کیا ہے۔ اُن کے احساسات

ایک پرجوش مسلم کے احساسات ہیں۔ اُن کا اسلام سے یہ عقیدت مندانہ تعلق دنیا میں ایسی حکومت چاہتا ہے جس میں مسلمانوں کے لئے قومیت اور وطنیت کی رکاوٹیں حائل نہ ہوسکیں۔ اُن کا نصب العین ایک ایسی آزاد مسلم برادری کا قیام ہے جس کا مرکز کعبہ ہو اور جو ایمان اور ایقان کے ساتھ اللہ اور اُس کے رسول پر مضبوط عقیدہ رکھتی ہو۔ اقبال نے اپنی مثنوی "اسرار و رموز" میں اسی کی تعلیم دی ہے۔ اُن کی دور بین نظر نے یہ دیکھ لیا تھا کہ ہندو عقلیت اور مسلم تصوف نے قوموں سے قوتِ عمل چھین کر اُن کو اپاہج بنا دیا۔ "حافظ" پر اُن کا انتقاد حقیقتاً اسی تباہ کن تصور کے خلاف آوازِ احتجاج بلند کرنا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے اُنہوں نے ایسے تصوری فلسفے اور متصوفانہ شاعری سے شدید اختلاف کیا ہے جس میں عمل کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو۔

نکلسن کا اقبال مرحوم کے متعلق یہ خیال صحیح ہے کہ وہ مغربی خیالات سے متاثر ہیں رہا جہاں تک نٹشے سے متاثر ہونے کا تعلق ہے اقبال نے شدید انکار کیا ہے، اور اُن کے لئے متأثر ہونا ناگزیر بھی تھا لیکن "فلسفۂ عجم" کے مصنف کے ساتھ یہ بے انصافی ہوگی کہ اُس کے خیالات کا ماخذ محض مغربی فلسفے کو قرار دیا جائے۔ اقبال کے نظام میں مغربی اور مشرقی دونوں قسم کے مفکرین کے نقاط نظر کی نمائندگی ہے اور اُن سب کو آمیز کرکے اُنہوں نے ایک مستقل فلسفیانہ نظام کی تشکیل کی ہے۔)

(مترجم)

(۱) مثنوی "اسرار خودی" کی فلسفیانہ اساس

بریڈلے نے کہا ہے، یہ کہ تجربہ کو محدود مرکز میں ہونا چاہیئے اور محدود ہذیت کی شکل اختیار کرنا چاہیئے بالآخر ناقابلِ تشریح ہے، وہ تجربات کے اِن ناقابل تشریح مرکزوں سے شروع کرکے ایک طرح کی وحدت پر پہونچ جاتا ہے جس کو وہ "مطلق" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ اس میں محدود مرکز اپنی محدودیت اور امتیاز کھو دیتا ہے۔ اُس کے قول کے مطابق محدود مرکز محض نمود ہیں۔

اُس کے نزدیک واقعیت کی معیاری خصوصیت شمولِ کل اور عموم ہے اور چونکہ ہر قسم کی محدودیت و اضافیت سے متاثر ہے لہذا مؤخر الذکر (یعنی محدودیت) محض دھوکا اور التباس ہے۔ لیکن میرے خیال میں تجربہ کا یہ ناقابلِ تشریح محدود مرکز کائنات کی بنیادی حقیقت ہے۔ زندگی شخصی اور انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ عمومی یا کلی حیات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ خدا خود شخصیت اور انفرادیت ہے، جو یکتا اور کامل ترین ہے۔ ڈاکٹر میٹیگرٹ نے لکھا ہے کہ "کائنات شخصیتوں اور انفرادیتوں کے ائتلاف و اجتماع کا نام ہے" مگر اس پر اتنا اضافہ اور چاہیئے کہ اس اجتماع اور ائتلاف کی ترتیب اور اُس میں توافق ازلی اور مکمل نہیں ہے، بلکہ یہ دانستہ اور باشعور کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہم درجہ بدرجہ بے نظمی سے نظم کی طرف بڑھ رہے ہیں اور اس کی تکمیل میں امداد دے رہے ہیں۔ اس ائتلاف اور اجتماع کے ارکان مقرر اور متعین نہیں ہیں۔ بلکہ اس اہم کام میں تعاون کے لئے نئے نئے رکن برابر آ رہے ہیں کائنات ایک مکمل عمل نہیں ہے بلکہ ہنوز تکمیل کے راستے میں ہے۔ کائنات کے متعلق کوئی مکمل صداقت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ وہ خود ابھی تک کل (یا مکمل) نہیں بن چکی ہے، بلکہ تخلیقی عمل ہنوز جاری ہے۔ اس بے نظمی کے کسی نہ کسی حصے میں نظم پیدا کرنے کا جہانتک تعلق ہے انسان بھی اپنا حق ادا کر رہا ہے۔ قرآن میں خدا کے علاوہ دوسرے خالقوں کے امکان کا اشارہ موجود ہے۔ (وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ)

ظاہر ہے کہ انسان اور کائنات کا یہ تصور انگریزی "نوہیگلی" تصور اور ساتھ ساتھ وحدت وجود کے حامی تصوف کی ایسی سب صورتوں کے خلاف ہے جو ایک عالم گیر حیات یا روح میں جذب ہو جانے کو انسان کا آخری نصب العین اور اُس کی نجات قرار دیتے ہیں۔ انسان کا اخلاقی اور مذہبی

نصب العین اپنی نفی نہیں ہے بلکہ اپنا اثبات ہے۔ وہ اس نصب العین کو زیادہ سے زیادہ منفرد اور زیادہ سے زیادہ یکتا اور کامل ہو کر ہی حاصل کر سکتا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ "یعنی اپنے آپ میں صفاتِ الٰہی پیدا کرو۔ چنانچہ سب سے زیادہ یکتا شخصیت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مشابہ ہو کر انسان یکتا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا حیات کیا ہے؟ انفرادیت۔ اُس کی اعلیٰ ترین صورت اس وقت تک "انا" یا خودی ہے جس میں انفرادیت اپنے علاوہ دوسری چیزوں کو اپنے آپ سے خارج کر دیتی ہے اور ایک محیط بالذات مرکز ہو جاتی ہے۔ جسمانی اور روحانی دونوں اعتبار سے انسان ایک محیط بالذات مرکز ہے، لیکن وہ ہنوز مکمل انفرادیت نہیں۔ اُس کا خدا سے جتنا بعد ہوتا ہے۔ اُتنی ہی اُس کی انفرادیت ضعیف ہوتی ہے۔ خدا سے سب سے زیادہ قریب، سب زیادہ کامل ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں، کہ وہ خدا میں جذب ہو جاتا ہے بلکہ برخلاف اس کے وہ خدا کو اپنے آپ میں جذب کر لیتا ہے۔ صحیح اور حقیقی فرد مادی عالم کو ہی اپنے آپ میں جذب نہیں کرتا ہے۔ بلکہ اُس پر قابو پا کر خود خدا کو بھی اپنے "انا" میں جذب کر لیتا ہے۔ حیات ایک جذب کرنے والی آگے کی طرف حرکت ہے جو اپنی رفتار میں ہر قسم کی رکاوٹوں کو جذب کر کے دور کر دیتی ہے۔ نصب العینوں اور آرزوؤں کی متواتر تخلیق اُس کی خاصیت ہے۔ اُس نے اپنی توسیع اور تحفظ کے لئے اپنے میں سے ہی حواس، عقل وغیرہ جیسے آلات ایجاد کر لئے ہیں یا اُن کو نشوونما دیا ہے جو رکاوٹوں کو جذب کرنے میں اُس کے معاون ہیں۔ راہِ حیات میں سب سے زیادہ مشکل رکاوٹ مادہ اور فطرت ہے لیکن فطرت شر نہیں ہے کیونکہ یہ حیات کی مخفی طاقتوں میں کھلنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔

"انا کو اپنے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنے سے آزادی حاصل ہوتی ہے۔ وہ ایک حد تک آزاد ہے اور ایک حد تک مقدر یا طے شدہ۔ مکمل آزادی آزاد ترین انفرادیت خدا پر متوجہ ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ مختصر لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیات نام ہے آزادی کے لئے جدوجہد کا۔

(۲) انا اور شخصیت کا تسلسل

مرکز حیات انسان میں "انا" یا شخصیت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ شخصیت ایک تکاثفی اور تجاذبی حالت ہے جو اس تکاثف کو قائم رکھنے سے ہی قائم رہ سکتی ہے۔ اگر تکاثفی اور تجاذبی حالت قائم نہ رہے تو اضمحلال واقع ہو جائے گا۔ شخصیت یا تکاثفی و تجاذبی حالت کا قیام انسان کا قیمتی کارنامہ ہے۔ اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ اضمحلال کی حالت کی طرف نہ لوٹ جائے۔ جو شے اس تکاثفی و تجاذبی حالت کو قائم رکھنے کا باعث ہو وہی ہمیں غیر فانی بنا دینے کی باعث ہے۔ شخصیت کا تصور ہمارے سامنے قدروں کا معیار پیش کر دیتا ہے، اور خیر و شر کے مسئلہ کو طے کر دیتا ہے۔ جو شے شخصیت کو استحکام بخشے اچھی ہے۔ اور جو اُس کو کمزور کرے بری ہے۔ فنون، مذاہب اور اخلاقیات کا فیصلہ شخصیت کے نقطۂ نظر سے ہی کرنا چاہیئے۔ افلاطون پر میرے انتقاد کا رخ حقیقتاً اُن تمام نظامہائے فلسفہ کے خلاف ہے، جو زندگی کے مقابلے میں فنا کو نصب العین قرار دیتے ہیں، وہ نظام جو زندگی کی سب سے بڑی رکاوٹ یعنی مادے کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اُس کو جذب کرنے کے بجائے اُس سے بھاگنے کی تعلیم دیتے ہیں۔

جس طرح "انا" کی آزادی کے سلسلے میں مادے کے مسئلہ سے دو چار ہونا پڑتا ہے، اُسی طرح اُس کے غیر فانی ہونے کے سلسلے میں مسئلہ زمان سامنے آجاتا ہے۔ برگسان ہمیں بتاتا ہے کہ زمان ایک لا انتہائی خط (اپنے مکانی مفہوم میں) نہیں ہے جس سے خواہ مخواہ ہمیں گزرنا ہی ہے۔ زمانے کا یہ تصور صحیح نہیں۔ حقیقی زمانے میں کوئی طول نہیں ہے۔ شخصی بقا ایک تمنا ہے اور اگر تم اُس کے حصول کی کوشش کرو تو حاصل کر سکتے ہو۔ یہ حصول اس زندگی میں تفکر و عمل کے اُن طریقوں کے اختیار کرنے پر موقوف ہے جو تکاثفی و تجاذبی حالت کو قائم رکھنے کے باعث ہوں۔ بدھ مت، ایرانی تصوف اور اسی طرح کے دوسرے نظامہائے اخلاق گو ہمارے مقصد کے مطابق نہیں، لیکن وہ بالکل بیکار

بھی نہیں ہیں، کیونکہ شدید جد و جہد کے بعد کچھ وقت کے لئے ہمیں تسکین اور خواب آور چیزوں کی ضرورت ہے۔ حیات کے روشن دنوں میں تفکر و عمل کی یہ صورتیں راتوں کی حیثیت رکھتی ہیں چنانچہ اگر ہمارے عمل کی توجہ تکاثفی و تجاذبی حالت کے قائم رکھنے کی طرف ہے تو موت کا صدمہ اُس پر اثر انداز نہ ہوگا۔ موت کے بعد اضمحلال کا ایک وقفہ ہو سکتا ہے، جیسا کہ قرآن نے برزخ یا ایک درمیانی حالت کے متعلق بیان کیا ہے جو یوم حشر تک قائم رہتا ہے۔ اس حالت میں وہی "انا" باقی رہیں گے جنہوں نے اس زندگی میں کافی نگہداشت کی ہے گو حیات اپنے ارتقا میں اعادے اور تکرار سے متنفر ہے پھر بھی بقول "ولڈن کار" برگسان کے اصول کے مطابق جسمانی حشر ممکن ہے۔ زمانے کو لمحات میں تقسیم کر کے اُس کو مکانی بنا لیتے ہیں اور پھر اُس پر غالب آنے میں دشواریاں محسوس کرتے ہیں۔ زمانے کا صحیح انداز، اپنے باطن کی گہرائی میں نظر ڈالنے سے ہوتا ہے حقیقی زمانہ خود حیات ہی ہے، جو اپنے آپ کو اُس وقت تک کی حاصل شدہ تکاثفی و تجاذبی حالت (شخصیت) کو قائم رکھ کر ہی محفوظ رکھ سکتی ہے۔ ہم زمانے کے اُس وقت تک ماتحت ہیں جب تک کہ ہم اُس کو مکانی سمجھیں۔ مکانی زمانہ ایک قسم کی بیڑی ہے جس کو حیات نے اپنے لئے گھڑ لیا ہے تاکہ موجودہ ماحول کے مطابق بن سکے۔ حقیقتاً ہم غیر زمانی ہیں اور یہ ممکن ہے کہ اسی زندگی میں ہم اپنے غیر زمانی ہونے کو محسوس کر لیں گو یہ کشف اور احساس ایک آنی ہی ہو۔

(۳) انا کی تعلیم

انا کا استحکام عشق سے ہوتا ہے یہ لفظ (اس موقع پر) بہت وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی ہیں جذب کر لینے اور اپنے آپ میں سمو لینے کی خواہش۔ اس کی سب سے اعلیٰ صورت قدروں اور نصب العینوں کی تخلیق اور اُن کو ایک واقعیت بنا لینے کی کوشش ہے۔ عشق،

عاشق اور معشوق دونوں کو منفرد بنا دیتا ہے۔ سب سے زیادہ یکتا شخصیت کی واقعیت کو مان لینے کی کوشش طالب کو منفرد بنا دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مطلوب کی انفرادیت کو متضمن ہوتی ہے، کیونکہ کوئی دوسری شے طالب کی فطرت کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ جس طرح عشق "انا" کو مستحکم کرتا ہے، اسی طرح سوال اُس کو کمزور کرتا ہے۔ جو شی بھی شخصی جد و جہد سے حاصل نہ ہو، سوال کے ہی تحت ہے۔ ایک مالدار شخص کا بیٹا جس کو باپ کی دولت وراثت میں ملی ہے، ایک بھکاری ہے یہی حال اُس شخص کا ہے، جو دوسروں کے خیال کو سامنے رکھ کر سوچتا ہے۔ لہذا " انا" کے استحکام کے لئے ہمیں عشق یعنی جذب کر لینے والے عمل کی طاقت کو نشو و نما دینا چاہئے، اور ہر قسم کے سوال یعنی بے عملی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت میں جذب کر لینے والے عمل کا سبق موجود ہے اور خصوصاً ایک مسلمان کے لئے۔

مثنوی کے دوسرے حصے میں میں نے اسلامی اخلاقیات کے عام اصولوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور شخصیت کے تصور کے سلسلے میں اُس کے معنی کے انکشاف کی کوشش کی ہے یکتائی کی جانب حرکت کرنے میں انا کو تین منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

(ا) قانون کی پابندی۔

(ب) ضبطِ نفس جو خود آگاہی یا انانیت کی سب سے اعلیٰ صورت ہے۔

(ج) نیابتِ الٰہی۔

نیابتِ الٰہی اس زمین پر انسانی نشو و نما کا تیسرا اور آخری درجہ ہے۔ نائب کی حیثیت کرۂ زمین پر خلیفۃ اللہ کی ہے۔ وہ کامل ترین "انا" ہے۔ انسانیت کا مقصود، ذہنی اور جسمانی دونوں قسم کی حیات کا منتہیٰ ہے۔ اُس میں ہماری ذہنی زندگی کی بے آہنگی ہم آہنگی بن جاتی ہے۔ اُس میں اعلیٰ ترین طاقت اعلیٰ ترین علم کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اُس کی زندگی میں خیال و عمل، استدلالی اور فکری علم سب

ایک ہو جاتے ہیں۔ نخلِ انسانیت کا وہ آخری ثمر ہے۔ اس لئے پر اذیت ارتقاء کے تمام ابتلا حق بجانب ہیں کہ نتیجے میں وہ پیدا ہوتا ہے۔ نوع انسان کا وہ حقیقی حاکم ہے۔ اُس کی حکومت خدا کی حکومت ہے وہ اپنی متاعِ فطرت میں سے دوسروں پر حیات کی دولت لٹاتا ہے اور اُن کو تدریجاً اپنے آپ سے قریب لاتا رہتا ہے۔ ارتقاء میں ہم جتنا آگے بڑھتے ہیں اُتنا ہی اُس سے نزدیک ہو جاتے ہیں۔ اُس تک پہنچنے میں ہم معیارِ حیات کے اعتبار سے اپنے آپ کو بلند کرتے ہیں۔ جسم و ذہن دونوں کے اعتبار سے انسانیت کا نشوونما اُس کی پیدائش کے لئے ایک مقدم شرط ہے۔ اگرچہ فی الحال اُس کی حیثیت ایک نصب العین کی سی ہے مگر انسانیت کے ارتقاء کا رُخ، کم و بیش یکتا افراد کی جمہوریت پیدا کرنے کی طرف ہے، جو اُس کے لئے مناسب اور موزوں "ماں باپ" ہوں گے۔ زمین پر خدا کی حکومت کے معنی دنیا کی ممکن بلند ترین شخصیت کے تحت کم و بیش یکتا افراد کی جمہوریت ہے نٹشے کو اس معیاری اور نصب العینی نسل کی ایک جھلک محسوس ہو گئی تھی لیکن اُس کے الحاد اور اعلیٰ طبقے کے لئے اُس کی عصبیت نے اُس کے پورے تصور کو بگاڑ کر رکھ دیا۔

خدمت

(جناب نعیم صدیقی صاحب)

عہدِ حاضر کی لعنتی تہذیب نے جو تحائف مسلمانوں کو دیئے ہیں ان میں "خدمت" کا جدید مفہوم بھی شامل ہے۔ مسلمان کا ذہن دھڑا دھڑ اس مفہوم کو قبول کر رہا ہے۔ اور آج صورتِ حالات یہ ہے کہ زنا اور سود کو فروغ دینا، نہرو اور گاندھی کی چوکھٹ پر سجدہ کے لئے دوسروں کو پکارنا، لینن اور کارل مارکس کے عقائد کی تعلیم دینا ایک مسلمان کی نظر میں قومی خدمت بنتا جا رہا ہے۔ کوئی ہمیں امریت سکھاتا ہے کسی طرف سے یورپین جمہوریت کی دعوت دی جاتی ہے۔ معاشرت کا فرنگی ضابطہ ہم پر نافذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ علوم و فنون کی بنیادیں الحاد و دہریت نفس پرستی اور راہ داری پر رکھی جاتی ہیں۔ جنت دوزخ، قیامت، دعا، نکاح، طلاق، غلامی، تعدادِ ازدواج، جہاد، پیغمبروں اور فرشتوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ طغیان و انی کے ان سارے مظاہر کو قومی خدمت سے تعبیر کر کے اسلام کے گلے پر چھری پھیری جاتی ہے۔ اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد سینے پر ہاتھ دھر کر اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ وہ اسلام جو پہاڑ کی طرح اٹل اور لوہے کی طرح سخت تھا۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ آج کا اسلام تو ربڑ کا بنا ہوا ہے جس طرف سے چاہو کھینچ کر لمبا کر لو۔ جہاں سے چاہو کسی حصے کو دبا دو۔ اس گمراہی کو مطلقاً روکا نہ جا سکتا اگر قرآن اور حدیث ہماری ہدایت کے لئے موجود نہ ہوتے۔

ہم یہاں یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یورپ نے خدمت کا کیا مفہوم مقرر کیا ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ کے انسان کی ساری زندگی بدل گئی تھی۔ اس کے سارے

شعبوں پر انقلابات کا تند و تیز سیلاب گذر چکا تھا انقلاب شدید عمل اور شدید ردِ عمل کا درمیانی واسطہ ہوتا ہے۔ وہ شدید عمل جس سے یورپ کا انسان تنگ آچکا تھا۔ مذہب کے دائرے میں کلیسا کے اجارہ داروں کی طرف سے شروع تھا۔ اور سیاسیات کے دائرے میں تاجداروں اور جاگیرداروں نے برپا کر رکھا تھا۔ مذہب عملی عمرانی زندگی میں امداد دینے کی بجائے سدِّ راہ تھا۔ کیونکہ وہ انسانی زندگی کو صرف رہبانیت ہی کے سانچے میں ڈھالنے کا طریقہ جانتا تھا۔ اور میدانِ سیاست میں سارے حقوق و اختیارات تاجداروں اور جاگیرداروں نے سمیٹ کر انسانی فطری آزادی کا گلا گھونٹ رکھا تھا۔ انسان کی فطرت آخر تڑپ کر اٹھی۔ اور اُس نے ایک ہی تڑپ میں دونوں بندھن توڑ کر پرے رکھ دیئے۔ اب مذہب کی طرف سے عملی زندگی میں رکاوٹ ڈالنے کا عمل مجبوری ختم ہو چکا تھا۔ اور سیاسیات میں عوام کی حکومت کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جاتا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ معاشرتی و معاشی دائرہ میں یہ کوشش ہو رہی تھی کہ فرد کی آزادی کا زیادہ سے زیادہ تحفظ کیا جائے۔ یہی خیال اپنی حدود کو چھوڑ کر جماعت کو فرد پر قربان کر دینے کا موجب بنتا گیا۔ الغرض ساری زندگی کے نظام میں انفرادی آزادی کو حدود سے متجاوز ہو جانے کے لئے حالات مہیا کئے گئے۔ عملی مذہب کے خاتمہ کے بعد کارت کی مشینری پر عوام کو جو قبضہ حاصل ہو گیا تھا اور مزید یہ کہ انفرادی آزادی کا سیال زوروں پر تھا۔ ان ساری چیزوں نے انسان کے ذہن اور جسم کو آزادانہ کام کرنے کا موقعہ دیا۔ یہاں پہنچ کر خدمت کی کوئی مخصوص حدود اور کوئی مخصوص معیار باقی نہیں رہتا۔ بلکہ ہر عمل کو بنی نوعِ انسان یا قوم کی خدمت قرار دیا جا سکتا ہے۔

اٹھارویں صدی سے یورپ کی وہ تاریخ شروع ہوتی ہے جس میں لذت اندوزی انسانیت کا منتہائے مقصود قرار پاتی ہے یہی لذت اندوزی کی خواہش چاہتی ہے کہ انفرادی آزادی کا دائرہ غیر محدود ہو۔ اس کے ماتحت ہی ایک اہلِ قلم جذبات انگیز افسانے اور فلمی ڈرامے لکھ کر اپنے آپ کو قومی خادم سمجھتا ہے۔ ایک ایکٹرس جو ہر شب کو ہزاروں شہوت کے غلاموں کے سامنے تھک کر سوتے ہوئے

شیطانوں کو جگاتی ہے ۔ اپنے زعم میں نوع انسانی پر بڑا احسان فرماتی ہے ۔ ایک شاعر فحش گیت گا کر، ایک مصور ننگی تصویریں بنا کر، ایک سرمایہ دار جوئے اور سٹے کا کاروبار جاری کر کے، ایک ساہو کار سود کی شکل میں نوع انسانی کا خون چوس کر، ایک جرنیل کسی کم طاقت قوم کو اپنے بیش التعداد لشکر کے پاؤں تلے روند کر قومی خادم کہلاتا ہے ۔ شراب خانے اور زنا کاری کے اڈے انسانی خدمت کے مرکز بن جاتے ہیں یہ سب کچھ اس انفرادی آزادی کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ جو استسقا کے مریض کی طرح بے تابانہ شہوات کے چشمہ کی طرف لپکتی ہے ۔ ہر جرعۂ آب اس کی پیاس کو اور بڑھا دیتا ہے ۔ وہ آئین و قوانین کی گردنت کو "حکومت عوام" کے ذریعے اور ڈھیلا کراتی ہے تا آنکہ اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اور قوم کی قوم کسی دوسری طاقت کی غلامی میں چلی جاتی ہے

سیاسیات کے میدان میں تشریف لائیے ۔ ایوان ہائے حکومت میں آپ کو مختلف الخیال پارٹیاں نظر آئیں گی ۔ کوئی مزدوروں کی حمایت کو نصب العین قرار دیئے ہوئے ہے کسی نے سرمایہ داری کے حقوق کی حفاظت کا فرض اپنے ذمے لیا ہوا ہے ۔ کوئی انتہا پسند ہے کوئی اعتدال پسند کسی کو جدت سے پیار ہے کوئی قدامت پرستی میں جکڑا ہوا ہے ۔ ایک طرف ٹوریوں کا گروہ ہے ۔ دوسری طرف آزاد خیال براجمان ہیں ۔ الغرض مختلف منزلوں کی طرف مختلف طریقوں سے قدم بڑھایا جا رہا ہے ۔ یہ تشتت و افتراق کہاں سے آیا ؟ کیا اس کی بنیاد ذہن کی اسی ناروا آزادی پر نہیں ہے ۔ جس کے لئے نہ وحی الٰہی کی مقرر کردہ حدود باقی ہیں ۔ نہ عقل سلیم کا کوئی ضابطہ ۔ ہر شخص آزاد ہے کہ کوئی سا مقصد اپنے لئے متعین کرے ۔ کوئی سی راہ اپنے لئے پسند کرے ۔ اور کسی طریقے سے اپنے سفر کو شروع کر دے ۔ نسل و وطن کی محبتیں بلا شبہ ان کے سامنے اپنی نسل کی ترقی اور اپنے وطن کی کامیابی کے نصب العین رکھتی ہے ۔ لیکن نسل کی بہبودی اور اہل وطن کی سرفرازی کا معیار ہر شخص کی نگاہوں میں ایک نہیں ہو سکتا ۔ اور نہ طریقہ ہائے کار ہی ایک ہو سکتے ہیں ۔

نتیجۃً افتراق و تشتت کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ ایک ہی نسل اور ایک ہی وطن میں رہنے والے مختلف اخبار، جماعتیں اور قائد مختلف معیار ہائے ترقی و کامیابی پیش کر رہے ہیں۔ اور کامیابی کے حصول کے لئے الگ الگ راستوں کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ ایک مشرق کی طرف کھینچتا ہے۔ دوسرا مغرب کی طرف۔ اور اس کا نتیجہ کیا ہو رہا ہے۔ کہ دنیا کی سلطنتوں کو اندرونی کشمکش کھائے جا رہی ہے۔ اور وہ چیز جسے قرآن "فتنہ" کے نام سے موسوم کرتا ہے ہر تخت کے نیچے پرورش پا رہی ہے

پھر انفرادی آزادی نے اہوا پرستی کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اور انفرادی و اجتماعی اخلاق ایک نئی نہج پر ترتیب پانے لگے ہیں نئے ضابطۂ اخلاق میں فتنۂ شہوات کے سیلاب کو روکنے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ بلکہ امن و سکون کو تباہ کرنے کے لئے اسے کافی آزادی عطا کی گئی ہے۔ لیکن قرآن اس چشمہ کو پہلے ہی بند کر لیتا ہے۔ اور زندگی کے ہر شعبے میں "حدود الٰہی" کی پابندی کو لازمی کر دیتا ہے۔ پھر رہی سہی کمی کشوں کا سدِ باب اس تقوی سے کر دیتا ہے۔ جسے پیدا کرنے کے لئے چند بنیادی عبادتوں کو فرض کر دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ۔ اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جس نے ہدایتِ ربانی سے روگردانی کر کے اہواءِ نفس کی پیروی کی۔ فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ (۸-۱۰) "خدا تعالےٰ نے اپنے رحم و کرم سے ایک فریق کو ہدایت دی۔ اور ایک فریق گمراہی میں رہ گیا۔ اس گمراہی کا سبب کیا ہے؟ بس یہ کہ انہوں نے خدا کو چھوڑ کر شیاطین کو اپنا دوست بنا رکھا ہے اور پھر اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ ہم ہدایت پر ہیں"۔ یہ صورت بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ لوگ اپنی اہوا پرستی کے طفیل گمراہ ہو جاتے ہیں۔ پھر اپنی گمراہی کو ہی ہدایت سمجھنے لگتے ہیں۔ اور اس گمراہی کی تبلیغ بطور ہدایت ہی کرنے لگتے ہیں۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ○

شیطان کے پیرو اور بغی و فساد کے علمبردار بھی اپنے آپ کو مصلحِ بنی نوعِ انسان اور خادمِ خلق سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جب بھی فساد سے روکا گیا۔ انہوں نے اپنی فتنہ انگیزیوں کو "اصلاحٌ بین الناس" قرار دے کر کان بند کر لیے۔ جب بھی انہیں تبلیغِ باطل یا افعالِ شنیعہ سے روکا گیا انہوں نے "اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ" کہہ کر اپنے آپ کو انبیا کے مقام پر لا کھڑا کیا۔ لیکن ان کے غلط ادعا سے یہ حقیقت بدل نہیں سکتی کہ یہ لوگ فسادی ہیں۔ تباہی کے بانی ہیں شیطان کے نمائندے ہیں۔ ان کے دماغ میں وہ قوت ہی نہیں رہی۔ جو حق و باطل کو الگ الگ پہچان سکے۔ خود ان کا سرکردہ ابلیس بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہے۔ وَقَاسَمَهُمَا اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ ہ شیطان بھی اپنے پیرووں کو قسمیں کھا کر ہی کہتا ہے۔ کہ میں تمہیں نصیحت کرنے والا ہوں"۔ تمام انسانوں کا خادم ہوں۔ کاروانِ انسانیت کے رہزن بھی رہبروں میں آ کر مل جاتے ہیں۔ غولِ بیابانی بھی وہی جامہ پہن لیتے ہیں جو خضرِ راہ کے لئے خاص ہے۔ اب ضروری ہو جاتا ہے کہ حق و صداقت کا کوئی خاص معیار ہو۔ ہدایت و نصیحت کی کوئی خاص پہچان ہو۔ خدمت اور عداوت میں کوئی وجہِ تمیز ہو۔ بس اسی ضرورت کے پورا کرنے کو قرآن اور حدیث ایک مسلمان کی نگاہ میں کافی ہیں۔ آیاتِ قرآنیہ اور سننِ نبویہ کی کسوٹی پر کھرا اور کھوٹا جدا ہو جاتا ہے۔ خدمت اور عداوت میں تمیز ہونے لگتی ہے۔ اصلاح اور عدوان میں حدود قائم ہو جاتی ہیں۔ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (۱۳-۱۱) قرآن اس لئے بھیجا گیا ہے۔ کہ تمہیں حق و صداقت اور دروغ و باطل کی پہچان ہو جائے۔ اگر نزولِ قرآن کے بعد بھی خدمت و اصلاح کے پردے میں فساد انگیزی کرنے والے اہوا پرستوں کی پیروی کی گئی تو پھر اللہ کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن ہندوستان میں دل و دماغ کے اوف ہو جانے کی وجہ سے اہوا پرستوں کی غیر اسلامی حرکت کو نہ صرف گوارا کیا جا رہا ہے۔ بلکہ ان کے دعوی کے مطابق ان کے جائز و ناجائز اعمال و کردار کو خدمتِ قوم، خدمتِ اسلام اور خدمتِ بنی نوع انسان

سمجھا جا رہا ہے۔

نوجوانانِ ملت جن کے اعمال پر قوم کی زندگی و موت کا انحصار ہے مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر اپنے نظامِ تمدن کے صاف ستھرے حوض میں یورپ کے جوہڑ کا گندا کیچڑ لا لا کر ملا رہے ہیں۔ اور قرآن سے دلائل مہیا کرتے ہیں کہ بس صرف اسی طرح ہمارا پانی آبِ حیات بن سکتا ہے۔

تہذیبِ فرنگ کی ظاہری چمک دمک کی بنیاد ہوا پرستی بے حیائی صنفی آوارگی اور انفرادی آزادی پر قائم ہے نوجوانوں کے دل بے اختیار ان چیزوں کی طرف کھینچتے ہیں شہوات کا شیطان اندر سے انہیں شہ دیتا ہے۔ اور وہ دن بدن اس ملحدانہ تہذیب کے اصولوں کو قبول کرنے میں سرعت دکھا رہے ہیں۔ یہاں کا ماحول دن بدن شہوت پرستانہ بن رہا ہے ہر گھر میں آرٹ گیلریاں ہیں، گراموفون اور ریڈیو ہیں انواع سنگار کے ساز و ساماں ہیں۔ اور وہ سب کچھ ہے جو مغرب نے زندگی کے لئے اپنا لیا ہے۔ چونکہ اس سارے سلسلے کے متعلق یہ تبلیغ ہو رہی ہے کہ یہ سب کچھ تمدنی ترقی ہے۔ اور اسلام بھی تمدنی ترقی چاہتا ہے۔ اس لئے اسے قبول کرنا اور فروغ دینا خدمت قوم ہے نتیجہ یہ ہے کہ ہر کوئی ناکس ترکوں کی طرح تہذیب جدیدہ کے ہر اچھے برے اصول اور ہر اچھے برے مظہر کو قبول کرتے ہوئے یہ یقین رکھتا ہے کہ اسلام کو اس سے کوئی صنف ضرر نہیں پہنچتا۔ اب اس تہذیب کی ضروریات پوری کرنے کے لئے جو کارخانے، ادارے اور دکانیں قائم کی جاتی ہیں۔ انہیں خدمتِ اسلام کا مرکز سمجھا جاتا ہے سبحان اللہ! کیا خوب ریڈیو پر لڑکے کچھ طرح فحش گیت گائیں تو دینِ مصطفٰی پر احسان، سینما کی سٹیج پر رانوں اور پستانوں کو ننگا ہوں کے سامنے عریاں لانے والی کوئی مس زبیدہ کسی فحش ڈرامے میں ایکٹ کریں تو "خدمتِ وطن" اور اگر کوئی بیسوا کسی غلامِ نفس کی آغوش میں گندی حرکات سے پلنگ کی چولوں کو مجبورِ فغاں کر رہی ہو تو ماشاء اللہ خدمت بنی نوعِ انسان۔ آخر لفظ "ترقی" کا معنیٰ اور معیار کیا ہے۔

بہ "تفنی ترقی" "عمل عمل" اور "خدمت خدمت" پکارنے والے اپنے مفہومِ ذہنی کو واضح کیوں نہیں
کرتے؟ یورپ کی تلوار نے مشرق کو کیا فتح کیا۔ مشرق کے ذہن بھی مغلوب ہو گئے۔ دریا پہاڑ اور زمین
ہی اغیار کے قبضے میں نہیں گئے دل و دماغ پر بھی دشمنوں کا قبضہ ہو گیا۔ اب جو اچھائی یا برائی مغرب
سے سر اٹھاتی نظر آتی ہے اس کے فروغ کے لئے ہمارے قائد اور اہلِ قلم، ہمارے شعرا اور صحیفہ نگار،
ہمارے تاجر اور سرمایہ دار پہلے ہی سے میدان تیار کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ قرآن کی آیات سے یورپ کی ہر
گمراہی کو "کارِ ثواب" ثابت کرنے کے لئے بڑے بڑے ادیب اور بڑے بڑے مقرر مصروفِ عمل ہیں۔
اور آج انہیں کے جہادِ مسلسل کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلامی دل و دماغ اسلامی دل و دماغ نہیں رہا۔

انجمن سازی کی جو وبا ہندوستان میں داخل ہوئی اس کا فروغ اس امر پر منحصر تھا کہ مختلف شعبہائے
حیات کو الگ الگ فرض کیا جائے۔ چنانچہ مذہب، سیاست، اخلاق، اقتصاد اور معیشت
کے دائرے علیحدہ علیحدہ کھینچے گئے۔ یہیں سے گونا گوں انجمنوں، جماعتوں، مجلسوں اور اداروں
کی ابتدا ہوتی ہے۔ کہیں طبیعات میں تحقیقاتیں کرنے کے لئے کوئی سوسائٹی قائم ہو رہی ہے کہیں
علمائے اسلام دین و مذہب کے فروغ کے لئے انجمن کی تاسیس کرتے ہیں تیسری طرف سیاسی ترفع
کے لئے کوئی لیگ قائم ہو رہی ہے۔ کہیں فوجی تحریک کا آغاز ہو رہا ہے۔ کسی جگہ سے اشتراکیت
کا چشمہ پھوٹ نکلتا ہے حال یہ ہے کہ ان سارے اداروں اور جماعتوں کی بنیادیں علیحدہ علیحدہ
نظریوں پر قائم ہیں۔ مقاصد جدا ہیں طریقِ کار الگ ہیں راستے مختلف ہیں۔ نہ قدر و قیمت کا معیار
ایک، نہ طرزِ فکر ایک، اور نہ اسلام کا تصور ایک۔

ایک ملتِ اسلامیہ کے اندر چھوٹی چھوٹی سینکڑوں ملتیں سر اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہر ملت کا کلمۂ
جامعہ ہی الگ ہے۔ پھر مذہب ہو یا سیاست، اقتصادیات ہوں یا سائنس، کوئی سا شعبۂ حیات
ہو۔ اگر نگاہیں ایک ہی رنگ میں رنگی ہوئی نہ ہوں۔ تو ہر شعبے میں ہر شخص کے نظریات مختلف ہوں گے۔

ایسی ہی صورت حالات یہاں موجود ہے۔ مذہب کی وادی میں سینکڑوں الگ الگ راہیں نکلی ہوئی ہیں۔ سیاسیات میں جدا جدا راستے ہیں۔ ترقی و ترفع کے الگ الگ معیار ہیں۔ قومیت کو انفرادیت کھائے چلی جا رہی ہے۔ کوئی نہیں جو اس کی باگ کھینچ لے۔ ہر شخص خادمِ ملت ہے اور ہر فرد محسنِ اسلام ہے خواہ اس نے اپنے کردار کو کوئی سی شکل بھی دے رکھی ہو۔

حد یہ ہوتی ہے کہ اسلام کی تحقیر و تذلیل کر کے چاندی کی ٹکلیاں کمانے والے، مسلمانوں کو دشمنوں کے ہاتھوں بیچنے والے، اور قومی غیرت و عزت کو بٹہ لگا کر پیٹ بھرنے والے لوگ بھی سید القوم قرار دیئے جاتے ہیں۔ کیا ظلم نہیں کہ بیواؤں کی حمایت میں زور شور سے لکھنے والا ایک شخص آج اپنے طور پر قومی خدمت کا مدعی ہے۔ اسے اپنے کارنامے پر غرور ہوتا ہے۔ کیا ظلم نہیں کہ پردۂ فلم پر گدھوں کی طرح ننگی ہو کر ناچنے والی ایک عورت عزت کی اس کرسی پر قبضہ کرتی چلی جا رہی ہے۔ جو ایوانِ اسلام میں قوم کے بہترین محسنوں کے لئے مخصوص ہے۔ کیا دل و دماغ کی قوتوں کے مختل ہو جانے کی انتہا نہیں کہ قرآنی آیات کو تاویلاتِ باطلہ سے موڑنے توڑنے، اور احادیث پر کیچڑ اچھالنے والے ایک مسلم نما شخص کو قوم اپنی دولت سے حصہ دے کر پیٹھ ٹھونکتی ہے۔ عورت کے متعلق اشتراکیتِ جدیدہ کے بام مارگی عقیدہ کو فروغ دینے والے ایک شاعر کی تصانیف کو خرید کر یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ فحاشی اب مشغلۂ لطیف شمار کیا جاتا ہے۔ اور اس کی اشاعت کرنے والے کی عزت کی جاتی ہے۔

ہر گناہ اور ہر ثواب کو "قومی خدمت" قرار دینا اس قوم کے لئے تو مناسب ہے جو زندگی کا کوئی مستقل ضابطہ نہیں رکھتی۔ جس کا کوئی حقیقی نصب العین نہیں ہے۔ اور جس نے برگشتہ عقل کی پیروی میں ہرزہ گردی کو پسند کر لیا ہے۔ لیکن کیا اس قوم کو خدمت کا لایعنی مفہوم حاصل ہے۔ جو مسلمان

کہلاتی ہے۔ اور جس نے اسلام لاتے ہی گویا اس امر کا وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں خدا کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرے گی اور جس کے لیے وحی الٰہی نے ایک لائحۂ عمل اور ایک منزل متعین کر دی ہے وہ راہِ عمل "عبادت" اور منزلِ مقصود "نیابتِ الٰہیہ" ہے اسلام میں عبادت کا مفہوم دوسرے مذاہب کے خلاف وسیع ہے۔ اس کے حلقے میں زندگی کا ہر چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا عمل داخل ہے۔ ذاتی اور پبلک اعمال میں کوئی تمیز نہیں، دین اور دنیا میں کوئی تفریق نہیں کسی عمل کو وحیٔ الٰہی کے مطابق رکھنا عبادت ہے اور اس کے خلاف عدوان۔ یہ عمل چاہے کھانا کھانے کا عمل ہو۔ چاہے سودا بیچنے کا درس دینے کا ہو یا روزہ رکھنے کا جنگ لڑنے کا ہو یا حکومت کرنے کا۔ خدائی احکام کی اطاعت اور حدود الٰہی کی پابندی جس شعبے میں بھی کی جائے۔ عبادت ہے اور جس شعبے میں غیر اللہ کی اطاعت کر لی جائے عدوان ہے۔ عبادت و گناہ کا یہ تصور غیر مسلم اقوام کے لئے قطعاً ناقابلِ فہم ہے بلکہ بدید عہد کے مسلمان بھی اسے ٹھیک طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ اس تصور کا گہرا تعلق خدمت کے اس مفہوم کے ساتھ ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔

ہمارا دین دوسرے موجود الوقت ادیان کی طرح دماغی آرائش کی ایک چیز نہیں ہے اور نہ یہ دین آسمانی بادشاہت یا نجات و نروان کا ایک وعدہ کر دینے کے بعد ہمیں دنیا میں بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے۔ یہ دین ایک تمدنی اور اجتماعی ضابطۂ حیات یا ایک سوشلزم ہے اور سوشلزم کی حیثیت سے ہی وہ زندگی کے تمام شعبوں کو مربوط قرار دے کر پوری زندگی کا ایک ہی ضابطہ پیش کرتا ہے۔ یہ دین عقل کو اس طرح آزاد نہیں چھوڑتا کہ وہ بنی نوعِ انسان کو جس کھڈ میں چاہے جا گرائے۔ بلکہ عقل سے صحیح طریقے پر کام لینا سکھاتا ہے۔ وہ اسے یکطرفہ فیصلہ دینے یا ماحول کے سامنے جھک جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ سائنس کے لئے حدود مقرر کرتا ہے۔ اخلاق کے معتدل اصول متعین کرتا ہے۔ معاشرت اور معیشت کی مشکلات کو حل کرتا ہے۔ ریاست و حکمرانی کا دستور سامنے لاتا ہے۔ اور پھر یہ چیزیں ناقابل

عمل نہیں۔ بلکہ خلافت راشدہ کے عہد میں ان پر عمل ہو چکا ہے ان پر عمل کرنے کے شاندار نتائج کو دنیا دیکھ چکی ہے۔ یہ بھی نہیں۔ کہ یہ چیزیں کسی عہد یا ملک یا نسل کے ساتھ مخصوص ہیں۔ نہیں بلکہ ہر ملک کے لئے موزوں، ہر نسل کے لئے متناسب اور ہر عہد کے لئے جاریہ ہیں۔

دراصل مسلمان ہوتے ہی ہم نے یہ اقرار کیا ہے کہ ہم زندگی کے ہر مسئلے کو صرف اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں گے۔ ہر پیچیدہ معاملے پر مسلمان کی طرح غور کریں گے۔ ساری زندگی کو قرآن کی آیات کے سانچے میں ڈھالیں گے۔ حکومت کریں گے۔ تو اس طرح جس طرح خدا اور اس کے رسول کا حکم ہوگا۔ تجارت کریں گے تو حدود الٰہی کا لحاظ کرتے ہوئے، جنگ لڑیں گے تو قرآن کے دستور جنگ کے مطابق۔ معاشرت کے مسائل کو حل کریں گے تو اسوۂ حسنہ کی روشنی میں، ـــــ ہمارا اصول صرف اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہوگا۔ کسی دوسرے کی اطاعت جزواً یا کلاً ہمارے حدودِ عمل سے خارج ہوگی۔ خواہ کوئی بادشاہِ وقت ہو یا دوست، پیر ہو یا مولوی نفس کی خواہش ہو یا شیطان، ماں باپ ہوں یا رشتہ دار۔ براہِ راست کسی کی اطاعت کرنا ہمارے نقطۂ نظر سے گناہ ہوگا۔ اور یہ کہ اللہ اور اس کا رسول کسی کی اطاعت کا حکم دیں ـــ الحب للہ والبغض اللہ۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر چل کر نیابتِ الٰہیہ کے اعلیٰ مقام کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

یہاں پہنچ کر ہمارے لئے قومی خدمت کا ایک مخصوص مفہوم قائم ہوتا ہے۔ وہ مفہوم یہ ہے۔ کہ قرآن و حدیث کے بتائے ہوئے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے قرآن و حدیث ہی کے بتائے ہوئے راہِ عمل پر قدم بڑھایا جائے اور اس کے بعد دوسروں کو بھی اسی نصب العین کی طرف اور اسی راہِ عمل پر بڑھنے میں مدد دی جائے۔ ایک پیشہ ور اور ایک تاجر دوکان میں بیٹھ کر، ایک اہلِ قلم دفتر کی میز پر قلم کو حرکت میں لا کر، ایک ماہر طبیعات ایجادات و اختراعات میں مصروف رہ کر، ایک مدرس مدرسہ کی چار دیواری میں بچوں کو "الف" "با" "تا" کا درس دے کر اور ایک طبیب اپنے مطلب میں مرضیٰ کا علاج کر کے اس نصب العین کی

طرف بڑھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی ہر حرکت کو منشائے اسلام کے تابع کر دے۔
مسلمان ہونے کے بعد ایک شاعر کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ قوم کو عیاشی کا سبق دے۔ ایک دکاندار کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ شراب اور سود کا کاروبار شروع کر دے۔ ایک سیاسی قائد مختار نہیں کہ کوئی ایسا نظام قوم کے لئے پسند کرے جس میں حقیقی حاکمیت کسی انسان کے ہاتھوں میں ہو۔ ایک اہلِ قلم آزاد نہیں کہ برہنگی و زناکاری کے طاعون کے جراثیم پھیلائے۔ مسلمان کہلانے والے شخص کو اگر مسلمان رہنے کی خواہش ہو تو اُسے قدم قدم پر احکامِ الٰہی کی پابندی کرنی ہوگی۔ اسلام کی پابندی میں جو فعل بھی اس سے صادر ہوگا۔ خدمت بنی نوعِ انسان یا قومی خدمت کے دائرے میں آئیگا۔ اور ضابطۂ قرآنی کے خلاف جو حرکت بھی ہوگی اسے "قوم دشمنی" اور اسلام دشمنی قرار دیا جائے گا۔

اسلام دنیا میں امن چاہتا ہے۔ فتنہ و فساد کو روکنا اس کے اولین فرائض میں ہے۔ اس غرض کے لئے وہ دوسرے محرف ادیان اور مذاہب باطلہ کی طرح تمدن کا خاتمہ نہیں کر دیتا۔ بلکہ تمدن کی پوری پوری ضروریات کو مدِنظر رکھ کر اجتماعی زندگی کا پورا دستور پیش کرتا ہے۔ اس دستور میں عقائد بھی شامل ہیں۔ جسمانی، مالی اور بنیادی اعمال بھی ہیں۔ عملی زندگی کے قانون بھی۔ اور ان ساری چیزوں پر دائرۂ عبادت محیط ہے۔ علمائے قرون مابعد نے عبادت کے تصور ہی کو قطعاً بدل ڈالا ہے ان کے خیال میں رکوع و سجود کی طرح کی چند حرکات جسمانی اور زبان سے چند الفاظ کا بار بار اعادہ کرنا ہی عبادت ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ عبادت نہیں بلکہ معاملت ہے۔ یہیں سے حقوق اللہ اور حقوق العباد، دین اور دنیا، نکوکاری اور دنیاداری میں غیر اسلامی طرز کی تفریق شروع ہوئی۔ حالانکہ عبادت کا مفہوم ایسا نہیں تھا۔ عبادت صرف یہ ہے۔

کہ نیابت الہیہ اور امن کے قیام کے لئے جو عمل یا خیال مفید ہو اسے اختیار کر لیا جائے اور جو مضر ہو اسے چھوڑ دیا جائے۔ اسی کے برعکس صورت گناہ کہلاتی ہے۔ قرآن اور حدیث نے انسانی زندگی کے مقصد "نیابت الہیہ" پر اثر انداز ہونے والے ہر محرک کا تذکرہ کر دیا ہے۔ مفید اعمال و خیالات و نظریات کو جدا کر دیا ہے اور مضر اعمال و خیالات و نظریات کی توضیح کر دی ہے۔ پھر قرآن کے مطالعہ سے آپ ہی آپ وہ طرز فکر حاصل ہو جاتی ہے جس کے معیار پر اگر ہر اچھی چیز اور بری چیز، ہر عبادت اور ہر گناہ ہر خدمت اور ہر عداوت پہچانی جانے لگتی ہے۔

قرآن اب بھی پڑھا جاتا ہے لیکن آخری تین صدیوں سے اس کا مطالعہ کچھ اس طرح ہو رہا ہے کہ نہ عبادت کا صحیح مفہوم ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے اور نہ گناہ کا حقیقی تصور۔ آج علما کا ایک ایسا طبقہ عام طور پر پایا جاتا ہے۔ جو عبادت کی صرف چند شکلوں کو ہی جانتا ہے۔ سجدے میں سر رکھ دینا اسے لذت دیتا ہے۔ لیکن رائے اور خیال کے بت کو جھکانا منظور نہیں۔ وہ نمازیں پانچ وقتوں سے گزر کر سات سات اور آٹھ آٹھ مرتبہ پڑھتا ہے لیکن نماز میں خدا سے عملی زندگی کے متعلق جو وعدے کرتا ہے انہیں پورا کرنے کا خیال تک نہیں لاتا۔ خدا کو راضی رکھنے کے لئے رمضان کے تیس دنوں کے علاوہ کئی مہینے مزید بھوک پیاس برداشت کرتا ہے لیکن کبھی اپنی کمائی میں سے کسی بھوکے کو کچھ دے نہیں سکتا۔ اس کے نزدیک نوافل کا فوت ہو جانا تو گناہ کبیرہ ہے لیکن تجارت میں جھوٹ اور وعدہ فراموشی کو استعمال کر لینا جائز ہے۔ مسجد کے اندر اونچی آواز سے بات کرنا اسے گوارا نہیں ہوتا لیکن مسجد کے باہر وہ غیر اللہ کے قانون حکومت کے آگے سر تسلیم خم رکھتا ہے۔ دراصل عبادت اور گناہ کے تصور کے ساتھ خدمت کے مفہوم کا گہرا علاقہ ہے۔ جہاں عبادت اور گناہ کا تصور ہی سرے سے غیر اسلامی ہو گیا ہو وہاں خدمت کا مفہوم کیونکر اسلامی رہ سکتا ہے۔ اگر آپ تھوڑے سے غور و فکر سے کام لیں تو واضح ہو جائے گا کہ ہر عبادت، اسلام، وطن، قوم، اور بنی نوع انسان کی

خدمت کے سوا کچھ نہیں۔ نیابتِ الہیہ کے قیام میں ہمیں اپنا اور ساری دنیائے انسانیت کا فائدہ نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے نیابتِ الٰہیہ کے قیام میں مدد دینے والا ہر فعل ہماری نگاہوں میں اسلام، وطن، اور بنی نوعِ انسان پر احسان ہے۔ اور اس مقصد کو جس فعل سے ضعف پہنچے۔ وہ خود ہمارے لئے، اہلِ وطن کے لئے اور بنی نوع انسان کے لئے مضر ہے۔

اسلام کے تمدنی نظام کی مثال کچھ ایسی ہے۔ جیسے تیندوا ہوتا ہے۔ جس کی تاریں چاروں طرف دور دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہر تار منفرد بھی ہوتی ہے اور دوسروں کے ساتھ متعلق بھی۔ تمدنِ اسلامیہ کا ہر قانون بجائے خود بھی قائم ہوتا ہے اور دوسرے شعبوں سے بھی اس کا علاقہ ہوتا ہے۔ اسی طرح نظامِ جماعت کا حال ہے۔ جو اسلام کی نگاہ میں سب سے مقدم چیز ہے۔ اس میں فرد کو جائز انفرادیت سے بھی محروم نہیں کیا جاتا۔ اور اس پر نظامِ جماعت کو قربان بھی نہیں کیا جاتا۔

اسلامی نظامِ تمدن کوئی ایک اصول توڑ دینا، گویا سارے تمدن کو نقصان پہنچانا ہے۔ اور اسی طرح جماعت اور فرد کا اپنے حدود سے باہر ہو کر کوئی کام کرنا، اس نظام جماعت کو مضر بیٹھتا ہے۔ جسے اساسی چیز قرار دیا گیا ہے۔ اسی لئے اس نظامِ تمدن یا نظام جماعت کو نقصان پہنچانے والا فروعی اور ادنیٰ معاملہ بھی اپنے اثرات کی وجہ سے بعض اوقات گناہ کبیرہ شمار ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے مفید ہونے والا بظاہر چھوٹا سا فعل بھی نتائج کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کے اعمالِ صالحہ میں شمار ہوتا ہے۔

خدمت کا جدید غیر اسلامی مفہوم جس قسم کی انفرادی ذہنی آزادی کے ساتھ لزوم و تلازم کا رشتہ رکھتا ہے اس کا ساتھ ساتھ پیدا ہونا ضروری تھا۔ یہ انفرادی آزادی خلافتِ راشدہ کے بعد شروع ہو گئی تھی۔ اور اسلام پر ایمان لانے والے لوگ دانستہ عملی زندگی میں دوسرے اصولِ حیات کو اختیار کر رہے تھے۔ اندازِ فکر بدل گیا تھا۔ لیکن مغربی افکار کی یورش نے تو اسلامی تصورات

کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب لارڈ میکالے کی تعلیمی اسکیم کے مطابق کام شروع ہوا۔ پھر انگریزی لٹریچر اور خیالات کی بارش برسنے لگی اور عربی زبان سے ہندوستانی مسلمان کا تعلق منقطع ہو گیا تو عملی ناسلمی کے ساتھ ساتھ رہے سہے عقاید بھی رخصت ہونے لگے۔

مغربی لٹریچر میں جذبات پر اثر انداز ہونے کا خاص وصف موجود تھا۔ استفہام و استعجاب اور تحقیر و تذلیل کے ہتھیار زور شور سے استعمال کئے گئے۔ کہا گیا کہ مذہب تو تمدنی ترقی میں حائل ہونے والا ہے۔ اسے دنیا کے ہر معاملے میں اہمیت دینا بھی کوئی معقول طریق کار ہے؟ مسلمانوں کے منہ فرطِ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ پچھلے دور میں شاید ہم غلطی میں مبتلا رہے ہیں۔ پھر کہا گیا بھلا مذہب کے ساتھ سیاست کا علاقہ کیا ہے؟ تاریخ دیکھو یہ تو سلاطین کی خواہشات کی آڑ رہا ہے۔ الغرض ان پیہم قلمی حملوں کا اثر یہ ہوا ہے کہ عملی زندگی کے بعد ذہنی زندگی بھی مجروح ہونے لگی۔ ذہنی تبدیلی نے یہ ستم ڈھادیا کہ گمراہ لوگوں نے اپنے آپ کو اہل ہدایت میں شمار کر کے دوسروں کو گمراہ کرنا شروع کر دیا اور عوام کی طرف سے مخالف اسلام تحاریک کی روک ٹوک کم ہو گئی۔ تاویلاتِ باطلہ کا سیلاب چڑھ آیا۔ اور آیاتِ قرآنیہ چلیپ ہو کر رہ گئیں۔ اب عقلِ انسانی وحی الٰہی کی حدود کے اندر کام کرنے سے انکار کر رہی تھی اور ہر شخص یہ سمجھنے لگا تھا کہ میں عقاید میں آزاد ہوں، خدا کو مانوں یا نہ مانوں، پیغمبر کو پیغمبر سمجھوں، ابن اللہ قرار دوں یا ایک عام ریفارمر، قرآن کو کلامِ خدا کہوں یا کلامِ نبی و جبریل، قیامت اور جنت و دوزخ کو بے حقیقت ڈراوا اور بے معنی لایعنی قرار دوں یا صداقتیں، نماز کو نماز سمجھوں یا ورزش، حج کو عبادت قرار دوں یا ایک سالانہ کانفرنس، زکوٰۃ کو زکوٰۃ خیال کروں یا ٹیکس، یہ میرے علم و بصیرت پر منحصر ہے۔ اور ان چیزوں سے آخر مسلمانیت میں کیا فرق آتا ہے۔

ایک دور کا غدار کا خیال تھا کہ مسلمانی زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ نماز روزہ کر لیا لیکن قرآن و حدیث کا واسطہ ان امور سے کیا ہے کہ میں ترازو کی ڈنڈی یوں رکھوں اور یوں نہ رکھوں۔ بری چیز کو اچھی کے

نیچے چھپاؤں یا نہ چھپاؤں۔ غلے کو روک رکھوں یا نہ روکوں، گاہکوں کو خوش کرنے کے لئے قسمیں کھاؤں یا نہ کھاؤں اور سود لوں یا نہ لوں۔ یہ میرے اپنے ذاتی اعمال ہیں۔ جو شعبۂ تجارت کے ساتھ خاص ہیں۔ شعبۂ مذہب کے ساتھ ان کا تعلق ہی نہیں۔ ایک مصنف یہ سوچتا تھا کہ عشق و محبت کے فسانے اور ناول پڑھنے سے عوام کو لذت حاصل ہوتی ہے اور اس کے بدلے میں مجھے چاندی کی جو ٹکلیاں ملتی ہیں انہیں کیوں گنواؤں۔ مصور یہ سوچ رہا تھا کہ تصویر کے فن سے یورپ نے بڑے فائدے اٹھائے ہیں یہ جوانی کا ایک آزاد مشغلہ اور وقت اور روپے کا ایک اعلیٰ مصرف ہے۔ اسلام نے اسے مصلحتاً کسی خاص زمانے کے لئے منع کیا ہوگا۔ ایک ترقی یافتہ تمدن کا لازمہ ہونے کی وجہ سے اسے اب چھوڑنا مشکل ہے۔ بھانڈوں کے ہاں طبلے پر تھاپ پڑتی اور ہمارا صوفی چلا اٹھتا کہ آخر وہ روحانی سر بلندی جو سماع ہی سے حاصل ہو سکتی ہے اہلِ اسلام کو ناپسند ہو تو ہو فی الاصل وہی اسلام ہے۔ زناکار سوچتا تھا کہ میں اگر تنہائی میں لطف کی چند گھڑیاں بسر کرتا ہوں تو آخر قوم اور سوسائٹی کو کونسا نقصان پہنچتا ہے۔ اور اسلام ایک عقلی مذہب ہونے کے بعد کسی غیر مضر فعل کو گناہ کیونکر قرار دیتا ہے۔ ایک لیڈر کا خیال یہ تھا کہ خلافت کا طریقِ حکومت اس زمانے میں ناقابلِ عمل ہے۔ آج کل تو بس "جمہوریت" یا "آمریت" ہی موزوں ہے۔ جو اسکی اپنی دولت کو اپنی سمجھتے ہوئے آزادانہ استعمال کا حق چاہتا تھا۔ انفرادی آزادی، خود ہی صغریٰ کبریٰ قائم کرتی اور استنتاج کا اپنا مخصوص طریقہ استعمال کرتی، شریعت کی ہر سد کو توڑتی جاتی تھی اور مسلمان جواری، مسلمان چور، مسلمان شرابی، مسلمان دھوکے باز، مسلمان زناکار، مسلمان اشتراکی مسلمان ملحد بلکہ مسلمان کافر اور مسلمان شیطان پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ لفظ مسلمان اپنے معانی سے محروم ہو کر محض ایک اسمِ علم کی حیثیت اختیار کر رہا تھا۔ غیر اسلامی معاشرت، غیر اسلامی سیاست، غیر اسلامی طرزِ حکومت، غیر اسلامی علوم و فنون، غیر اسلامی نظریات، غیر اسلامی معیارِ قدر و قیمت، اور غیر اسلامی طرزِ فکر اختیار کر لینے سے ہمارے جدید مسلمان کی مسلمانیت میں کوئی فرق نہیں آتا بلکہ اس کے مسلمان ہونے کے لئے یہی کافی تھا کہ

وہ ایک برہمن یا اچھوت، مغل یا پٹھان، کی طرح مسلمان کہلانے والے والدین کی اولاد تھا۔ کیا مسلمانیت کی یہ صورت "خدمت" کا جدید مفہوم واضح نہیں کر دیتی۔ ایسے مسلمان کی نگاہ میں مجرد عمل، محض دولت کمانا، صرف کوئی کام کرنا خواہ مخواہ خدمتِ قوم ہو جاتا ہے۔ خواہ عمل کی صورت کچھ ہی کیوں نہ ہو کمانے کا کوئی طریقہ اختیار کیا جائے۔ اور جائز یا ناجائز کوئی نا کام کر لیا جائے۔

کیا آج کوئی نگاہ ایسی نہیں رہی جو قرآن و حدیث کے مغز تک پہنچے۔ کیا دین کی روح کو کوئی دل نہیں سمجھ سکتا۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا۔ کہ قرآنی صراطِ مستقیم کو سمجھا جائے؟ کیا ابھی اسلام کو عملی صورت دینے کے لئے حالات مہیا نہیں ہیں۔ کیا قرآن کا پیغام کسی خاص عہد، کسی خاص قوم اور کسی خاص نسل کے لئے تھا؟ اگر ایسا نہیں ہے تو آج ہی ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ قرآن اور مصطفیٰ پر ایمان لانے کے بعد بنی نوعِ انسان، قوم اور اسلام کی خدمت کا طریقہ کیا ہے۔

ان لوگوں کو اپنی راہ پر چلنے دیجئے جو مسلمانوں جیسے نام رکھنے یا مسلمانوں کے گھر پیدا ہونے کی وجہ سے مسلمان کہلاتے ہیں۔ جن کی ابن الوقتی اور موقعہ طلبی ہر سانچے میں ڈھل جانا گوارا کر لیتی ہے جن کا منافق دل محمدؐ پر ایمان لانے کے بعد گاندھی اور نہرو، ہٹلر اور مسولینی، کارل مارکس اور لینن کی پیروی تڑاپ تڑاپ کر کر سکتا ہے۔ یہ لوگ ہمارے کام کے نہیں ہیں۔ ہم اس شخص سے فیصلہ پوچھتے ہیں۔ جو والذین یومنون بما انزل الیك، میں شامل ہے۔ اور جس نے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتے ہی اس حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے کہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم ایسے شخص کا فیصلہ سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ زندگی کے ہر معاملے کو اسلام کے اصول اور احکام سے حل کیا جائے۔ اور اس چیز کو نصب العین زندگی بنایا جائے جسے قرآن نے نصب العین کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اور اس کے حصول کے لئے جو راہ قرآن نے تجویز

کی ہے۔ صرف اسی راہ کو انتخاب کیا جائے۔ تو ایسے شخص کو سمجھ رکھنا چاہئے کہ اس نصب العین کی طرف بڑھنے میں جو کوشش صرف کی جائے گی، خدمت ہوگی۔ اور اس کے خلاف ہر فعل "قوم دشمنی" سمجھا جائے گا۔ ترقی ہے تو یہی، اصلاح ہے تو یہی، کامیابی ہے تو یہی اور خدمت ہے تو یہی ہے۔ آؤ اور قرآن سے بصیرت حاصل کرو۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (۳-۱۰)

خدا کے نزدیک سچا دین صرف اسلام ہے۔ اسی کے اصول و قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنا نیکی اور خدمت ہے اور قوم اور بنی نوعِ انسان کی بھلائی اسی میں ہے۔ اہل کتاب میں سے ظہورِ حق کے بعد جن لوگوں نے اس راہ سے انحراف کیا اور احکامِ الٰہی سے روگردانی اختیار کی تو وہ جان رکھیں کہ اللہ حساب لینے میں جلدی کرنے والا ہے وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۝ (۵-۱۵) اس سے بہتر طریقِ حیات کس کا ہو سکتا ہے جس نے خدا کے ہر فرمان پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ طریقِ احسان پر چلا اور ملتِ ابراہیم کی پیروی کی۔

وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (۸-۶) رسولِ مصطفٰےؐ نے واضح کر دیا کہ بس دنیا میں منزلِ حیات کو طے کرنے کے لئے جتنے راستے ہیں ان میں صراطِ مستقیم ایک ہی ہے اور وہ وہی ہے جس پر میں چل رہا ہوں۔ اور جس کی طرف دعوت دے رہا ہوں۔ لوگو! صراطِ مستقیم پر چلو منفرق راستوں پر نہ چلو۔ ورنہ راہِ حق سے دور ہو جاؤ گے۔ اور اسی لئے تمہیں بار بار ہدایت کی جاتی ہے کہ تم تقویٰ پر قائم ہو جاؤ۔

زندگی کے مختلف مسائل کو مختلف نقطہ ہائے نظر سے حل کرنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ انسان

مستقلاً کسی ایک طریقۂ حیات کو اور کسی ایک ہی برتر قوت کی پیروی کو قائم نہیں رکھ سکتا اور یہ امر توحید اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسی لئے متفرق راستوں پر چلنے کی ممانعت کردی گئی۔ اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیآء قلیلاً مّا تذکرون ۰ (۸-۷) زندگی کا کوئی شعبہ ہو۔ تمدن کا کوئی مسئلہ ہو۔ سیاست کی گتھی کو سلجھانا ہو، معاشرت کی کوئی پیچیدگی پیشِ نظر ہو۔ الیات میں کوئی دقت پیش آئے۔ تم صرف اسی پیغام کی پیروی پر مامور کئے گئے ہو۔ جو خدا کی طرف سے تمہیں پہنچا ہے۔ اپنی مقرر کردہ اور پسندیدہ برتر قوتوں کی پیروی چھوڑ دو۔ تم لوگ غور و فکر سے کم کام لیتے ہو۔

نہ تو عقل کے نام پر تم وحی الٰہی کی مخالفت کرسکتے ہو۔ اور نہ فطرت کے نام پر، نہ حالاتِ زمانہ کو اپنی سہل پسندی کی آڑ بنا سکتے ہو۔ اور نہ شہواتِ نفسانی کے لئے کوئی دوسری کمین گاہ بنا سکتے ہو۔ خدا کی نظر تمہاری عقل سے زیادہ دوربین ہے وہ فطرت کو سمجھتی ہے۔ حالات زمانہ کو دیکھتی ہے۔ اور حال کے ساتھ ساتھ استقبال کو بھی محیط ہے۔

قل اننی ھدانی ربی الی صراطٍ مستقیمٍ ۵ دیناً قیماً ملۃ ابراھیم حنیفاً۔ وما کان من المشرکین۔ قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین۔ لاشریک لہٗ وبذٰلک امرت وانا اوّل المسلمین ۰ (۸-۷)

اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ اللہ ہی نے مجھے راہِ ہدایت دکھائی اسی نے مجھے ابراہیمؑ کے صحیح اور مضبوط طریقے پر چلایا۔ وہ ابراہیمؑ جنہوں نے قانونِ الٰہی میں کسی دوسرے قانون کی آمیزش نہ کی۔ خدا کے سوا کسی کے حکم کا اتباع نہ کیا۔ یعنی شرک سے پرہیز کیا۔ اور کہہ دیجئے کہ میری نماز اور زندگی کی دوسری ساری عبادتیں اور میرا جینا مرنا سب کچھ اللہ اور اس کی اطاعت کے لئے ہے۔ میرا ہر فعل اور حرکت اسی کے حکم کی پیروی ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں کوئی دوسری قوتِ برتر قابلِ اتباع

نہیں ہے۔ مجھے اسی عقیدے کا حکم دیا گیا ہے اور میری نگاہوں میں اس عقیدے کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہی خدمت بھی ہے احسان بھی اور عبادت بھی۔ اور بنی نوع انسان کے ساتھ حقیقتاً ہمدردی کی صرف یہی ایک صورت ہے۔ اور میں اللہ کا پورا پورا فرماں بردار ہوں۔

قرآن کی حقیقت صرف یہی ہے کہ اس میں زندگی کے ہر شعبے کی صحیح ترتیب و تنظیم کے طریقے اور اصول بتائے گئے ہیں انسان دوسرے انسانوں کی خدمت کس طرح کر سکتا ہے۔ کہ نظامِ تمدن میں فساد پیدا نہ ہو۔ اس کا سلوک کائنات اور فطرت کی قوتوں کے ساتھ کیا ہونا چاہیے۔ اسے خدا کے کس طرح رشتہ استوار کرنا چاہیئے۔ کتب انزلنہ الیک لتخرج الناس من الظلمٰت الی النور۔ کہ کر اس کی وضاحت کر دی گئی کہ قرآن کا اتباع ہی ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے۔ اس میں زندگی کی مشکلات اور مہمات امور کا حل ہے۔ اس میں مدنی و عمرانی ثقافتی و تہذیبی، اجتماعی و انفرادی درد دل کا مداوا ہے۔ اس لحاظ سے قرآن پر ایمان لانا اس پر عمل کرنا اور دوسروں کو انہیں امور کی دعوت دینا انسانی برادری کی بہترین خدمت قرار پاتا ہے ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدیٰ و یتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ما تولی ونصلہ جھنم وساءت مصیرا ٥ (۵-۱۴)

قرآن کے ذریعے سے نیکی اور بدی، ہدایت و ضلالت، راستی و کذب، تسلیم و طغیان کی وضاحت ہو چکی قد تبین الرشد من الغی۔ بنی نوع انسان کی خدمت اور دشمنی کی حدیں الگ الگ ہو گئیں۔ اب بھی اگر کوئی شخص رسول سے روگردانی کرتا ہے اور مسلمانوں کے راستے کو چھوڑتا ہے۔ زندگی کے کسی مسئلے کو بھی غیر اسلامی نقطۂ نظر سے سوچتا اور حل کرتا ہے تو وہ ابدی گمراہی میں مبتلا ہو جائے گا۔ جس غلط راستے پر وہ چل نکلا ہے۔ اللہ کی پیدا کردہ طاقتیں اور حالات زمانہ اسے اسی پر چلاتی رہیں گی تا آنکہ وہ جہنم کے برے ٹھکانے تک پہنچ جائے۔ یہاں ایک مسلمان کے لئے عقل پرستی،

فطرت پرستی، ترقی پرستی یا تہذیب پرستی کا کوئی موقعہ نہیں چھوڑا گیا میں نہیں سمجھتا کہ ان آیات کے ہوتے ہوئے کوئی مولینا ہمیں کس طرح وطن پرستانہ قومیت میں جذب کرنے کی دعوت دے سکتے ہیں۔ کوئی شیخ الہند ہمیں گاندھی اور نہرو کے غیر مومنانہ سیاسی نظریات اختیار کرنے کا مشورہ کیسے دے سکتے ہیں۔ کوئی امام الہند کیونکر ایک ہندوستانی تہذیب و تمدن کے فروغ واستیلا کے لئے تقریریں کر سکتے ہیں۔ کوئی مسلم غیر اللہ کی حکومت میں کیسے شریک ہونے کا خیال دل میں لا سکتے ہیں ۔ اور کسی خاں صاحب کا کیا حق ہے کہ وہ "عدم تشدد" کے اصول کی اشاعت کے لئے زندگی وقف کر دیں۔

قائدین ملت جو سب سے بڑی قومی خدمت کے مدعی ہیں۔ اور تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر کے دعویدار ہیں۔ معروف و منکر کی صحیح تعریف ہی قائم نہیں کر سکے۔ قرآن کی روشنی میں وہ اس کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ ایک مسلمان کے لئے عبادت، احسان، اور خدمت قوم کی حدود کہاں تک وسیع ہیں۔ نادانستہ یا دانستہ انہوں نے بھی خدمت کا وہی تصور قبول کر رکھا ہے۔ جس کی ورزش مدیورپ سے ہو رہی ہے۔ قائدین کی اس روش کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ قوم کی قوم ان لوگوں کی تعریف میں آ رہی ہے جن کے متعلق کہا گیا ہے۔ کہ الذین اتخذ وا دینھم لھوا ولعبا وغرتھم الحیوۃ الدنیا۔ کیا دین آج ایک کھیل نہیں بن گیا۔ کیا ہر شخص اسے اپنی اہوا کے مطابق موڑ توڑ نہیں لیتا۔ کیا آج بھی یہ حالت نہیں ہے کہ کل حزب بما لدیھم فرحون ہ

آیئے ذرا سوچئے کیا ایک سوشلسٹ کسی سرمایہ دارانہ نظام تمدن کے اصول و فروع کو قبول کر سکتا ہے۔ کیا وہ سود کے کاروبار کو جاری کر سکتا ہے۔ کیا وہ مزدور طبقہ پر ظلم کر سکتا ہے۔ کیا وہ کسی بیمہ کمپنی کا حصہ دار بن سکتا ہے۔ کیا وہ کلیسا کی طرف سے وعظ کہہ سکتا ہے۔ آخر وہ کیوں اپنے

اوپر پابندیاں عائد کرتا ہے۔ دراصل اس نے ایک اصول پر ایمان لا رکھا ہے۔ وہ دل سے ایک خاص نصب العین کو قبول کر چکا ہے وہ بنا یا ہی اس لئے گیا ہے کہ سود اور جوئے، اور سرمایہ داری کو نشو و نما دینے والے دوسرے اسباب کو ختم کرے۔ پھر وہ سرمایہ داری کی تقویت کا موجب کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کا فرض قرار پاتا ہے کہ وہ ہر دوسرے مذہب کو ختم کرنے کے لئے جدوجہد کرے اور صرف لینن کارل مارکس کے مذہبِ اشتراکیت کو پھیلائے پھر وہ ثقفِ کلیسا کے فرائض کیونکر انجام دے سکتا ہے۔

وہ اگر ادیب ہوگا تو سوشلسٹ ادیب ہوگا۔ تاجر ہوگا۔ تو سوشلسٹ تاجر ہوگا۔ یہ کیوں اس لئے کہ زندگی کے ایک خاص نظام پر وہ ایمان لا چکا ہے۔ ایک خاص نصب العین اس کے سامنے ہے اور ہر وہ عمل جو اس نصب العین کے لئے مفید اور اس کے ایمان کے مطابق ہو اس کے نزدیک نیکی اور خدمت ہے۔ اور اس کے خلاف ہر عمل بدی اور ظلم ہے۔ وہ خود سوشلسٹ ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ وہ بنی نوعِ انسان کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ دوسروں میں سوشلزم کو پھیلانے اور مستحکم کرنے کی کوشش کرکے وہ یہ سمجھتا ہے کہ اولادِ آدم پر احسان کر رہا ہے۔ کیونکہ اس نگاہوں میں خود اس کا اور ساری دنیا کا امن سے زندگی بسر کرنا صرف سوشلزم کے ذریعے ہی ممکن ہے پھر وہ کیونکر کسی غیر اشتراکی نظریہ کو اختیار کر سکتا ہے۔ کیونکر کسی سرمایہ دارانہ تمدن میں شریک ہو سکتا ہے۔ اور کیونکر غیر اشتراکی اصول و آئین کو قبول کر سکتا ہے۔

اسی طرح ایک مسلمان کی حالت ہے۔ قرآن کے پیش کردہ نظامِ حیات پر ایمان لانے کے بعد وہ یہ نہیں کر سکتا کہ اس کے آئین و اصول کے خلاف کسی شعبۂ حیات میں کوئی دوسرا آئین و اصول قبول کرے۔ وہ غیر اللہ کی حاکمیت و آمریت کو قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کا فریضہ صرف یہی ہے کہ اللہ کی حکومت کو جاری کرے۔ اور غیر اللہ میں سے جو کوئی بھی آمریت کا دعویٰ

کرے اس سے لڑے۔ وہ وطن پرست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ انسانوں کی بنائی ہوئی ساری حد بندیوں کو توڑ کر صرف ایمان بالقرآن کو کلمۂ جامعہ قرار دیتا ہے۔ وہ سیاسیات میں فریب کاری اور دروغ بافی کا کافرانہ طریقے استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی آمد کا مقصد ہی یہی ہے کہ کافرانہ طور طریقوں کا قلع قمع کرے وہ سود اور جوئے کا کاروبار نہیں کر سکتا عیاشی کی راہ پر گام زن نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ چیزیں اس کے نصب العین پر مضر اثر ڈالتی ہیں۔ اگر کسی شخص کا طریقہ منافقت نہیں تو اس کا فرض ہے کہ وہ جس خیال کو قبول کرتا ہے اس پر عمل کرے۔ جس نظام پر ایمان لاتا ہے اسے کسی بیرونی دباؤ کے بغیر اپنے اوپر نافذ کرے۔ مسلمان ایک خاص نظام پر ایمان لاتا ہے۔ حدود اللہ کے اندر رہنے کا اقرار کرتا ہے۔ پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ اس خاص نظام اور ان حدود اللہ کے باہر کوئی قدم رکھ سکتا ہے تو کیونکر؟ وہ کارخانے میں ہو یا ایوانِ حکومت میں، کھیت میں ہو یا دکان میں، دفتر میں ہو یا مدرسے میں اس امر میں کوشاں رہے گا کہ اس کا کوئی فعل غیر اسلامی نہ ہو۔ اور اس کی سعی یہ ہو گی کہ وہ دوسروں کو بھی اسی نظام کی طرف راغب کرے۔ جسے اس نے قبول کر رکھا ہے۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس۔ لیکن مسلمان کیا کر رہے ہیں۔ وہ کہتے تو یہی ہیں۔ کہ ہم اسلام پر ایمان لاتے ہیں۔ لیکن عملی طور پر وہ اسلام کے نظامِ حیات کو بالکل چھوڑ رہے ہیں اور اس کی بجائے غیر اسلامی نظام ہائے حیات کے ایک ایک جزو کو قبول کر رہے ہیں۔ یا تو شریفانہ طریقہ یہ ہے کہ اسلام سے انکار کر دیا جائے۔ اور یا اسے زبان سے ماننے کے بعد عملی شکل دینی ضروری ہے۔ کیا مسلمان ایک مادہ پرست سوشلسٹ سے بھی گرا ہوا ہے۔

مسلمان رہنے والے کے لئے ضروری ہے۔ کہ قرآن و حدیث کے بتلائے ہوئے نیک و بد اعمال کو پہچانے اوامر پر عمل کرے اور منہیات سے اجتناب برتے۔ بس اُس کی یہی خدمت ہے

موٹا تازہ۔ قوی با رُعب خوبصورت اور سُرخ بنانے والا نایاب مُرکب

مردوں اور عورتوں کی پوشیدہ بیماریوں اور بدنی کمزوریوں کو دُور کرنے والا اکسیر۔

اس مُرکب کی یہ خاصیت ہے کہ سیروں دُودھ اور کئی چھٹانک مکھن روزانہ ہضم کر لیتا ہے۔

سینکڑوں لاغر کمزور نحیف اور مُردہ صورت اسے کھا کر موٹے تازے سُرخ اور قوی الجسم بن چکے ہیں۔

آج اپنا وزن کرلو اور اسے ایک ماہ کھانے کے بعد پھر تولو۔ دیکھو کتنا وزن بڑھتا ہے۔

معدہ کو قوت دیتا۔ بھوک خوب لگاتا اور قبض کی عادت کو دُور کرتا ہے۔ مقوی اعضائے رئیسہ اور دل۔ دماغ۔ جگر کو بھی قوت بخشتا ہے مادہ تولید پر اس کا خاص اثر ہوتا مرد اور عورت کی مخصوص بیماریوں کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ بیماری کی حالت میں ہی اس کا استعمال کیا جائے بلکہ تندرست مرد عورتیں۔ بچے اور بوڑھے ہر عمر اور ہر موسم میں اس کا استعمال کرکے اپنے جسم کو نہایت مضبوط اور طاقتور بنا سکتے ہیں۔ قیمت فی ڈبیہ صرف دو روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ } دواخانہ چشمہ صحت جی ڈی اندرون [illegible] دروازہ لاہور

حکیم الامت ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال رح کی مندرجہ ذیل کتب اس وقت دستیاب ہو سکتی ہیں
باقی کتابیں اس وقت نایاب ہیں۔ ضرورت مند حضرات بروقت طلب فرما سکتے ہیں۔

بالِ جبریل۔ حال ہی میں تازہ ایڈیشن چھپ کر آیا ہے یہ کتاب تمام اردو نظم ہے قیمت تین روپے علاوہ محصول ڈاک۔

ضربِ کلیم۔ یہ بھی تمام اردو نظم ہے قیمت ۲/۸ " "

بانگِ درا۔ اردو نظم کا سب سے پہلا مجموعہ قیمت ۳/۸ " "

مثنوی اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی (فارسی) قیمت ۲/۸ " "

ارمغانِ حجاز۔ علامہ صاحب کا سب سے آخری کلام قیمت ۲/- " "

SECRECTS OF THE SELF مثنوی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ قیمت ۳ روپے

ملنے کا پتہ:۔ مینیجر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاجپورہ۔ لاہور

ستر سال کے بوڑھے بھی جوان ہو جائیں گے

بال کالا تیل درجہ اوّل

یہ تیل ایک انگریزی ڈاکٹر کی تازہ ایجاد ہے جس کے استعمال سے برف جیسے سفید بال جڑ سے قدرتی کالے ہو جاتے ہیں اور پھر کالے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو دگنی قیمت واپس کی گارنٹی ہے جو ہر شیشی کے ساتھ لکھ کر دی جاتی ہے ہم چیلنج کرتے ہیں کہ کوئی ہمارے تیل کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ قیمت فی شیشی تین روپے آٹھ آنے خرچ ڈاک علاوہ۔

ملنے کا پتہ:۔ پنجاب ٹریڈنگ کمپنی نمبر ۳۵ B نسبت روڈ۔ لاہور

سالانہ قیمت

عوام سے چار روپے | قرآن نمبر | رؤسا سے چھ روپے

پیغامِ حق !

ظفر منزل تاج پورہ لاہور

جلد ۵ | نومبر و دسمبر ۱۹۴۱ء | عدد ۵/ ۶

سید محمد شاہ پرنٹر پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع کرا کر دفتر رسالہ "پیغام حق" ظفر منزل تاجپورہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

قرآن مجید خدائے لم یزل کا وہ کلام ہے جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر اس لئے نازل ہوا کہ بنی نوع انسان اس کی ہدایات کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھال کر دنیا میں فلاح و کامرانی اور آخرت میں نجاح و شادمانی حاصل کریں چنانچہ اس سرچشمۂ ہدائت سے جن سعادت مند روحوں نے فائدہ اُٹھایا اُن کی قابلِ رشک زندگیوں کے نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ مگر افسوس اور صد افسوس کا مقام ہے کہ اب کئی صدیوں سے لوگوں نے اس سرچشمۂ ہدائت سے ہدائت حاصل کرنا بند کر دیا ہے اس نے زندگی کے لئے جو پروگرام وضع کیا تھا یا تو اُسے سمجھنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی جاتی اور یا اگر سمجھا بھی جاتا ہے تو فقدانِ ہمت کا اس قدر افسون چل گیا ہے کہ اُسے بحالاتِ موجودہ ناقابلِ عمل ٹھہرایا جاتا ہے۔ لے دے کے صرف اتنی بات رہ گئی ہے کہ بعض انتہائی درجہ کے "متدین حضرات" اس سے گنڈے تعویز کا کام لے لینا ہی بڑی خدمت خیال کرتے ہیں۔

بقول علامہ اقبال مرحوم اگر ہم لوگ بحیثیتِ مسلمان زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے یہ اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ہم قرآن کو اپنا لائحہ عمل نہ بنائیں اور اس کے ساتھ اپنا دامن خوب اچھی طرح وابستہ نہ کریں۔

خدا کا شکر ہے کہ اس وقت یہ احساس مسلمانوں کے ایک طبقہ میں پیدا ہونے لگا ہے اور مولٰنا ابو الاعلیٰ مودودی جیسے نیک نیت، سنجیدہ مزاج، خدا ترس اور باہمت حضرات اس امر کی کوشش کرنے لگے ہیں کہ لوگ قرآنِ مجید کو ایک بار پھر اپنا لائحہ عمل بنانے کے لئے آمادہ ہو جائیں چنانچہ مولانائے ممدوح کا رسالہ ترجمان القرآن ۱۹۳۲ء سے یہ خدمت بجا لا رہا ہے اور الحمد اللہ مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا کرنے میں اُسے عظیم الشان کامیابی نصیب

ہوئی ہے۔ ہم اپنے قارئین کرام سے درخواست کریں گے کہ وہ خود عربی زبان پڑھیں اور اپنے بچوں کو لازمی طور پر عربی زبان پڑھائیں اور قرآن مجید سے براہ راست استفادہ کرنا سیکھیں۔ مسلمانوں کا یہ ادبار اُس وقت تک نہیں جاسکتا اور یہ نحوست اُس وقت تک دور نہیں ہوسکتی جب تک وہ قرآن کریم کی ہدایات پر چلنا نہیں سیکھتے۔

"پیغام حق" کا یہ "قرآن نمبر" ملک کے بلند پایہ اہل قلم اور قابل احترام علماء کے مضامین کا حامل ہے۔ اس مجموعہ میں اور بھی بہت سے مضامین تھے مگر کاغذ کی گرانی کی وجہ سے سب مضامین کو اسی ایک مجموعہ میں شائع کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ تقریباً اسی قدر مجموعہ باقی رہ گیا ہے خدا کو منظور ہوا تو ان باقی ماندہ مضامین کو پھر کسی دوسرے موقع پر شائع کیا جائے گا۔

کاغذ کی گرانی اور نایابی کا حال کس سے پوشیدہ ہے۔ گزشتہ دنوں میں صرف وہی اخبارات ورسائل شائع ہو سکے جن کے پاس کاغذ کے ذخائر پہلے سے موجود تھے کیونکہ دوکانداروں نے نفع اندوزی کے لالچ میں قیمتیں پانچ گنا تک بڑھادی تھیں۔ اس لئے غریب اداروں کے لئے کاغذ خریدنے کا کوئی موقع باقی نہ تھا۔ اب گورنمنٹ آف انڈیا نے کاغذ کی قیمتوں کا کنٹرول کیا ہے اگرچہ یہ قیمتیں بھی پہلے کی نسبت بہت زیادہ ہیں تاہم غنیمت ہے مگر بڑی مصیبت یہ ہے کہ سوداگران کاغذ ان قیمتوں پر کاغذ بیچتے نہیں۔ یہ وجوہات تھیں کہ نومبر و دسمبر و جنوری کا پیغام حق شائع نہ ہوسکا۔ الحمد للہ خدا نے ایسا سامان بنادیا ہے کہ اب پھر پیغام حق مثل سابق وقت پر شائع ہوتا رہے گا۔

نومبر و دسمبر کا پرچہ آپ کے سامنے ہے اور جنوری اور فروری کا زیر طبع ہے۔ لہٰذا جن حضرات کا چندہ دسمبر یا جنوری میں ختم ہوتا ہے براہ کرم وہ چار روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجکر ممنون فرمادیں۔ یا وی۔پی۔پی کی اجازت دیں کاغذ کی گرانی کے پیش نظر چندہ تین روپے سے چار روپے کرنا پڑا ہے اگرچہ خرچ اس سے بھی پورا نہیں ہوتا مگر قارئین کرام توجہ کریں تو خریداروں کی تعداد بڑھ سکتی ہے اور اس طرح خرچ پورا ہوسکتا ہے

یا اُن کو پیامِ ازلی[1] نے یہ بتایا

(ادریس احمد مینائی خالد حیدر آباد دکن)

اوروں کو مبارک ہو صنم خانۂ افرنگ
توحید کے عشاق کو ہر نوع صنم ننگ

ہے باعثِ بربادیٔ تہذیب حقیقی
کہتے ہیں جسے کور نظر دانش افرنگ

خالد کی نگاہوں نے سبھی دیکھے ہیں گلستان
مغرب کی بہاروں پہ ہے کیوں عقلِ جہاں دنگ

ہو داغ کلیجے میں لئے خرم و شاداں
ڈھونڈے پہ بھی ایسا نہیں پایا گلِ خوش رنگ

جب تک کہ نہ ہو زور دمنافع کا تقاضہ
اُس دیس میں اپنوں کے بھی ہیں قلب نظر تنگ

اقبال نے یہ درس دیا ہم کو خودی کا
ہے مردِ خود آگاہ سدا صاحبِ اورنگ

وہ تیرے ہی کردار کے ہوتے ہیں کرشمے
تو جن کو کہا کرتا ہے تقدیر کے نیرنگ

دل کو بھی ٹٹولا کبھی حق کے متلاشی!
کیا فلسفہ یونان کا؟ اک فلسفۂ سنگ

مضمر ہے تری ذات میں وہ جوہر ذاتی
ہیں جس سے طلسماتِ دل و عقل کے نیرنگ

دل ہی تو وہ اک سازِ خدا داد ہے جس میں
محفوظ ہے خود سازِ سرِ عرش کی آہنگ

ہو عشق کی مضراب تو یہ نعرۂ تکبیر
شرمندہ کن نغمۂ ہر ہر طبل و چنگ

محبوبۂ ملت کے شہیدانِ جواں بخت
شمشیر پہ آنے نہیں دیتے ہیں کبھی زنگ

وہ رنگِ حنا کے کبھی قائل نہیں ہوتے
اُن کے لئے اللہ کے دشمن کا لہو رنگ

یا اُن کو پیام ازلی نے یہ بتایا
اللہ کے بندوں کو بس اللہ[2] ہی کا رنگ

ہاں بڑھ کہ مجاہد کے لئے عرصۂ ہستی
یا کارگہِ جنگ ہے یا معرکۂ جنگ

یوں شاہد فطرت نے مسلماں کو سکھایا
ہوتے نہیں شیرانِ جواں جنگ سے دل تنگ

---

[1] قرآنِ پاک۔ [2] صبغۃ اللہ: "تو کہہ دے کہ ہم نے پسند کر لیا رنگ اللہ کا اور کس کا رنگ بہتر اللہ کے رنگ سے" قرآن

اطاعت رسول صلعم

(حافظ سراج الدین محمود بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ بہاول پور)

"پھر قسم ہے تیرے رب کی یہ لوگ مسلمان نہ ہوں گے۔ جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کا آپس میں جو جھگڑا ہو اُس میں یہ لوگ آپ سے فیصلہ نہ کرا دیں پھر آپ کے اس فیصلے سے اپنے دلوں میں تنگی بھی نہ پائیں۔ اور اُس کو مان لیں جیسا کہ ماننے کا حق ہے۔"

عہد اسلام سے قبل کی انسانی تاریخ انبیاء و رسل پر ایمان لانے والوں کے ایمان و اخلاص کی ان بلند ترین مثالوں سے یکسر خالی ہے جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ظہور میں آئیں اکثر مومنین کی زندگیوں کے حالات جو پیغمبر دل پر ایمان لانے والوں میں سابقون الاولون کے زمرہ میں شمار ہوئے۔ بہت مایوس کن ثابت ہوئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم تو اس معاملے میں اپنی بدنامی کی شہرت کو خوب قائم رکھتی رہی ہے۔ فرعون سے رہائی، دریا سے سلامتی سے گزر جانا۔ دشمن کا ان کی آنکھوں کے سامنے غرق ہو جانا بھی ان کے ایمان و اخلاص کی استقامت کا باعث نہ بن سکا۔ اللہ کی یہ سب رحمتیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی جس وقت اُن کو یہ خوشخبری سنائی گئی کہ وہ تمہارے سامنے دودھ اور شہد کی نہروں والا ملک ہے۔ جس کا خدا نے تم سے وعدہ کیا، تم اس طرف بڑھو خداوند قدس تمہارے دشمنوں کو تم سے خائف کر دے گا، وہ فرار ہو جائیں گے اور تم غالب ہو گے تو مومنین کے اس چھ لاکھ کے گروہ نے جواب دیا۔

فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ۔ یعنی آپ اور آپ کے اللہ میاں چلیے اور دونوں لڑ بھڑ لیجیے ہم تو یہاں سے سرکتے نہیں۔ اس چھ لاکھ کے گروہ میں صرف دو انسان ایسے نکلے کہ جنہوں نے حق کی تائید میں زبان کھولی اسی لیے موسیٰ علیہ السلام کو بارگاہ الٰہی میں فریاد کرنی پڑی :۔

"اے میرے رب مجھے اپنی اور اپنے بھائی کی جان کے سوا کسی پر کوئی اختیار حاصل نہیں۔" وقت گزرتا گیا خدا کی طرف سے اس کے بندوں کو پیغام لانے والوں کا سلسلہ ہر عہد اور ہر قوم میں برابر جاری ہا انسانیت کی تعلیم کی تکمیل کے لیے نظام ربانی برابر مصروف عمل رہا

یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ نے امن و محبت کے وعظ سے انسانی قلوب کو گرمانا چاہا ان پر ایمان لانے والوں میں حواریین کو خاص عظمت حاصل تھی پھر ان سب میں سے بڑے حواری یہودہ کو جو تقرب ان کی ذات کے ساتھ حاصل تھا بائیبل کے صفحات پر اس کی شہادت آج تک ثبت ہے لیکن حضرت عیسیٰ کی گرفتاری میں اس بہترین رفیق کا ہاتھ ہی تھا بلکہ اس نے اپنی غداری کے صلے میں حکومت وقت سے ستائیس عدد سکے حاصل کر کے اپنے ایمان و اخلاص کو اس قدر سستے داموں فروخت کر دینے میں بھی کوئی ذلت محسوس نہیں کی تھی۔ ان حالات اور روایات کی صدائے بازگشت فضا میں موجود تھی اور انسانی وحشت و بربریت اور ضلالت و گمراہی کی تاریک ترین گھٹا فضائے بسیط پر چھائی ہوئی تھی کہ سرکار دو عالم سرور کائنات محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا آفتاب عالمتاب اُفق عالم پر نمودار ہوا باد سموم سے جھلسے ہوئے صحرائے عرب کی آتشیں سرزمین پر انسانی اخلاق و عظمت کی مستحکم بنیادیں استوار ہونی شروع ہوئیں اور بنی نوع انسان کی تربیت کے لئے فیضان سماوی کے دروازے کھول دیئے گئے جوں جوں وقت گذرتا گیا وحی الٰہی کی تاثیر اور صحبت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فیض و اثر نے بادیہ نشینانِ عرب کی کایا پلٹ دی تکمیل اخلاقِ انسانی کے لئے اس معلم اول نے اپنی عدیم النظیر زندگی کے تیرہ سال صرف کر دیئے تو اس قدر عظیم الشان نتائج حاصل ہو چکے تھے کہ قیامت تک کے لئے تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے قاصر رہے گی۔

ایک خاص معاملے کے متعلق جب مندرجہ عنوان آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی کھڑے ہوئے اور عرض کی اگر ہمیں حکم ہو کہ ہم اپنی جانوں کو اپنے ہاتھ سے قربان کر دیں تو میں اس کے لئے حاضر ہوں۔ حضور نے فرمایا "تم نے سچ کہا ابوبکرؓ" اور اس معاملے میں رفیق غار تنہا نہ تھے بلکہ سینکڑوں دلدادگانِ عشق نبی کے حکم کی تعمیل کے لئے ہمہ تن گوش تھے۔ ابتدائے دنیا سے یہی دستور رہا کہ جنگ و پیکار کا سلسلہ دشمنوں کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ حرب و ضرب اور آتش و خون کا یہ کھیل لیگانوں کے ساتھ نہیں بیگانوں کے ساتھ کھیلا جایا کرتا ہے لیکن جنگ بدر کے موقعہ پر مخلصین اسلام کے لئے یہ کس قدر آزمائش اور امتحان کا وقت تھا کہ بھائی کو بھائی اور بیٹے کو باپ اور خسر کو داماد کے خلاف تلوار اٹھانی پڑی حضرت ابوبکر صدیق رضی اگر اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کے خلاف نبرد آزما تھے تو حضرت عمر کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین تھی تین سو تیرہ رفیقوں میں سے کسی ایک کی پیشانی پر بھی شکن نہ پڑی۔

صحبت نبویؐ کے تربیت یافتہ مردوں کا تو خیر کیا ذکر ہے۔ جنس لطیف کی سی کمزور و ضعیف مخلوق کی استقامت و

محبت اور اخلاص کی مثالیں کہیں دوسری جگہ ڈھونڈے سے نہیں ملیں گی۔ ایک عورت کا باپ بھائی۔ بیٹا اور شوہر یکے بعد دیگرے شہید ہوگئے باری باری سے ان کی شہادت کی اطلاع اس فدایہ حق کو کی گئی ہر نئی شہادت کی خبر پر وہ عشق و محبتِ حق کی یہ رازدار دریافت کر لیتی تھی کہ حضور انورؐ تو بخیریت ہیں آخر اس کے شوہر کی شہادت کی خبر پر جب اس کے استفسار کے جواب میں اسے معلوم ہوا کہ حضورؐ بخیریت ہیں تو اس پروانہ رخ شمع نبوی علیہ السلام کے منہ سے جو الفاظ نکلے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فضا میں گونجتے رہیں گے۔

"تیرے ہوتے سب مصیبتیں ہیچ ہیں"

ماں باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا تیرے ہوتے ہوئے اے شہ دیں کیا چیز ہیں ہم

لیکن واحسرتا و صد افسوس کہ آج وہی قوم دنیا میں اپنی نافرمانیوں کافرماجرائیوں اور انکار و حجت کے لئے مشہور ہو چکی ہے۔ برسر عدالت اس بات کے اقرار پر فخر کرنا کہ ہم شریعت کے نہیں بلکہ ہندی رواج کے پابند ہیں یہ اسلام اُس کے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم اور اس کی کتاب سے انکار ...... نہیں تو پھر اور کیا ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی گوشہ بھی اس انکار و حجت سے خالی نہیں ہماری معیشت ہماری معاشرت اور ہماری سیاست شریعت حقہ کے اثر و نفوذ سے کلیتہً آزاد ہو چکی ہیں۔

لیکن پھر بھی ہمیں اپنی ذلت و نامرادی اور خسران کے اسباب و وجوہ کی تلاش ہے گویا ہمیں یہ معلوم ہی نہیں۔ یہود اپنی صریح نافرمانیوں اور عدول حکمیوں کا احساس بھی کھو چکے تھے۔ اس لئے موسیٰؑ نے جب وہ ان میں موجود تھے ان کی رفاقت سے پناہ مانگی تھی بعینہٖ ہم آج اپنی بدا فعالیوں سے بے خبر ہیں لیکن ہماری یہ بے خبری ہمیں ہمارے جرائم کی پاداش سے نہیں بچا سکتی دنیا میں ہمارے اعمال کی سزا ہمیں مل رہی ہے اور قیامت کے دن کس قدر حسرت فزا ہو گی۔ ہماری وہ حالت جب وقت ختم رسل صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے قَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (اور رسول کہیں گے کہ اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو بالکل نظرانداز کر رکھا تھا)

چند نایاب اسلامی کتب اور اُن کی قیمتوں میں حیرت انگیز رعایت

تفسیر القرآن مکمل آٹھ جلدوں میں۔ (اُردو) قرآن پاک کی بہترین اور مکمل ترین تفسیر۔ آج تک مصر اور دنیائے اسلام کے دیگر حصوں میں جس قدر تفاسیر شائع ہوئی ہیں یہ تفسیر اُن تمام تفاسیر کا نچوڑ ہے۔ آج تک ہندوستان بھر میں اس حیثیت کی کوئی تفسیر شائع نہیں ہوئی اصلی قیمت مکمل سٹ اکیس ۲۱ روپیہ۔ رعایتی قیمت دس ۱۰ روپیہ آٹھ آنہ (غیر مجلد)۔ قیمت مجلد بارہ ۱۲ روپیہ آٹھ آنہ۔

جواہر قرآنی مصر کے مشہور عالم علامہ شیخ طنطاوی جوہری مصری کی مشہور اور معرکتہ الآرا تصنیف کا اُردو ترجمہ رعایتی قیمت ۱۲

سیرت الرسول ۔ سیرت النبی معروف بہ سیرت ابن ہشام کا اُردو ترجمہ۔ دو حصوں میں قیمت مکمل سٹ۔ رعایتی ایک روپیہ چار آنے

انجیل برناس ۔ اُس مقدس انجیل کا اُردو ترجمہ ہے جس کو عاملان دین عیسوی نے عہد تاریک میں بالکل نابود کر دیا تھا کیونکہ اس میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی صریح خبر موجود ہے نہایت قیمتی بلکہ نایاب تاریخی تحفہ ہے رعایتی قیمت دو روپیہ

فاتحۃ العلوم ۔ تفسیر کبیر جلد اول کا اُردو ترجمہ۔ امام فخر الدین رازی کی تفسیر سورۃ الحمد کا مکمل اُردو ترجمہ۔ کاغذ قدرے بوسیدہ۔ اصلی قیمت تین روپیہ۔ رعایتی ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

تاریخ مراکش ۔ مراکش کے مشہور مورخ کی تصنیف کا اُردو ترجمہ۔ مراکش کی مکمل اور اُردو زبان میں پہلی تاریخ تین جلدوں میں۔ رعایتی قیمت مکمل سٹ دو روپیہ چار آنہ۔

سفر دار المصطفےٰ ۔ ایک یورپین جاسوس کا سفر حجاز۔ اور اُس کے رُوح فرسا کارناموں کا مفصل بیان۔ رعایتی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

عہد حکومت سلطنت عثمانیہ کی تاریخ۔ سلطان عبد الحمید کے عہد کی مفصل داستان رعایتی قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:- **مینجر رسالہ ایشیا لاہور**

ضروری نوٹ:- (۱) محصولڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا۔ (۲) تفسیر القرآن کے آرڈر کے ساتھ پیشگی دو روپیہ آنے چاہئیں ورنہ تعمیل ارشاد نہ ہوگی۔ (۳) تفسیر القرآن بوجہ وزنی ہونے کے صرف بذریعہ ریلوے پارسل ارسال کی جاتی ہے۔ اس لئے اپنے قریبی ریلوے اسٹیشن کا نام تحریر کریں۔

تعظیم کلام اللہ الکریم

(از مولانا عبد اللہ العمادی)

(۱)

آج کی تلویحات کا مفاد یہ ہے کہ کلام اللہ جو حیات انسانی کے لئے سرمایۂ سعادت ہے، مسلمان اس کی دل سے تعظیم کریں اور یہ تعظیم ان کی جان و تن سے نمایاں ہو، اس کے لئے تعظیم کا مفہوم سمجھنے کی بھی ضرورت ہے، جس کے آغاز سے پہلے ایک تمہید کا انجام دیکھنے کے قابل ہے۔

علامہ تقی الدین احمد بن عبد القادر المقریزی ایک شہرۂ آفاق مورخ ہیں جن کی کتاب "الخطط والآثار" مصر کی جغرافی تاریخ میں ماخذ مانی گئی ہے، ان کی ایک اہم تالیف "النقود الاسلامیہ" بھی ہے جس میں اسلامی سکّے کی تاریخ دی ہے ۱۲۹۸ھ میں یہ کتاب شیخ احمد فارس شدیاق کے مطبعۃ الجوائب (قسطنطنیہ) میں چھپی تھی اس تلویح کی تمہید اسی کتاب پر مبنی ہے۔

(۲)

ہجرت نبوی کے اٹھارہویں سال جو خلافت فاروقی کا آٹھواں سال تھا اسلامی سکّے مضروب ہوئے یہ سکّے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ضرب کرائے ان میں کسی کا نقش درہم الحمد للہ تھا کسی کا "محمد رسول اللہ" اور کسی پر "لا الہ الا اللہ وحدہٗ"۔ لہ

خلافت راشدہ میں اسی قسم کے سکّے رائج تھے، بنی امیہ کے عہد میں عبد الملک بن مروان نے اس کی تجدید کی اور حجاج بن یوسف نے اس کو ترقی دی، اس ذیل میں ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔

کان مما ضرب الحجاج الدراھم البیض   حجاج نے جو سکّے ضرب کرائے ان میں چاندی کے درہم بھی تھے

لہ۔ النقود الاسلامیہ۔ ص ۴ و ۵۔

ونقش علیہا "قل ھو اللہ احد" فقال القراء قاتل اللہ الحجاج ای شئ صنع للناس الآن یاخذہ الجنب والحائض وکانت الدراھم قبل منقوشۃ بالفارسیۃ فکرہ ناس من القراء مسّھا وھم علیٰ غیر طھارۃ وقیل لھا "المکروھیۃ" فعرفت بذٰلک۔

جن پر "قل ہو اللہ احد" نقش تھا، قاریان کلام اللہ کہنے لگے کہ "اللہ حجاج کو غارت کرے، لوگوں کے لئے یہ کیا بنا رکھا ہے، جو مرد نجس ہوں اور جن عورتوں کو طہر کی نوبت نہ آئی ہو، اب تو وہ بھی اسے لیں گے" اس سے پہلے جو درم تھے ان پر فارسی میں نقش ہوتا تھا قاریان کلام اللہ کی ایک جماعت نے بے طہارتی کی حالت میں ان سکوں کا چھونا مکروہ قرار دیا، ان کا نام "مکروہیہ" پڑ گیا اور عرف عام نے اسی نام کو شہرت دی۔

ووقع فی المدینۃ ان مالکا رحمہ سئل عن تغییر کتابتہ الدنانیر والدراھم لما فیہا کتاب اللہ عزوجل فقال۔

مدینہ منورہ میں یہ واقعہ پیش آیا، کہ آیات قرآنی کے باعث نقش دینار و درم کو بدل دینے کے لئے امام مالک علیہ الرحمہ سے استفتا کیا گیا، امام موصوف نے فرمایا۔

"اول ما ضربت علی عھد عبد الملک بن مروان والناس متوافرون، فما انکر احدٌ ذٰلک وما رأیت اھل العلم انکروہ، و لقد بلغنی ان ابن سیرین کان یکرہ ان یبیع بھا ویشتری، ولم ار احداً منع ذلک ھھنا" یعنی رحمہ اللہ اھل المدینۃ النبویۃ۔

اس طرح کے سکے پہلے پہل عبد الملک بن مروان کے عہد میں ضرب ہوئے تھے، اس زمانے میں بہتیرے بزرگان دین موجود تھے لیکن کسی ایک نے بھی اس کو برا نہ جانا میں نے دیکھا تک نہیں کہ اہل علم نے اس کی برائی کی ہو۔ البتہ مجھے یہ خبر ملی تھی کہ ابن سیرین ایسے سکوں سے خرید و فروخت مکروہ قرار دیتے تھے مگر یہاں تو میں نے کسی ایک کو اس کی ممانعت کرتے نہیں دیکھا۔ "یہاں" سے امام مالک کی مراد اہل مدینہ منورہ ہیں۔

وقیل لعمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ ھذہ

حضرت عمر بن عبد العزیز علیہ الرحمہ جب خلیفہ ہوئے تو ان

الدراھم البیض فیھا کتاب اللہ یقبلھا الیھودی والنصرانی والجنب والحایض فان رأیت ان تامر بمحوھا۔

سے گذارش کی گئی کہ چاندی کے ان درہموں پر کلام اللہ کی آیتیں نقش ہوتی ہیں، یہودی بھی ان سے معاملت کرتے ہیں، نصرانی بھی نجس مرد بھی اور ناپاک عورتیں بھی، اگر آپ کی رائے ہو تو نقش آیات کے مٹانے کا حکم دے دیجئے۔

فقال۔

حضرت عمر بن عبد العزیز نے جواب دیا:۔

"اردت ان تحتج علینا الامم ان غیرنا توحید ربنا واسم نبینا صلی اللہ علیہ وسلم"

اس کہنے سے تمہاری غرض یہ تھی کہ دنیا کی قومیں ہم پر اعتراض کریں کہ خود ہم نے اپنے پروردگار کی توحید اور اپنے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کا نام مٹا دیا۔ [۱]

(۴)

اس طویل اقتباس سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ تعظیم اللہ کے متعلق۔

اہل مدینۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعامل کیا تھا؟

امام مالک رضی اللہ عنہ کا فتویٰ کیا ہے؟

حضرت عمر بن عبد العزیز کیا کہتے تھے؟

اور عصر تابعین میں کہ خیر القرون کا جزو ثانی تھا، کلام آلہی کے ادب کی نسبت مذہبی رائے کیا تھی؟

بے شبہ ہر مسلمان کا مقدس فرض ہے کہ اس مجموعۂ برکت و رحمت کو ادب و احترام کی نظر سے دیکھے اجلال اکرام کے ساتھ اس کے لئے گوش بر آواز رہے، یہ بھی تعظیم ہے، لیکن اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔

آپ ظاہری تعظیم پر زور دیجئے، چشم ما روشن۔

آپ مس مصحف کے لئے طہارت شرط کیجئے، دل ماشاد۔

لیکن عمل بھی تو ایک شرط تعظیم ہے۔ اس کو کیوں بھول جائیے؟

[۱] النقود الاسلامیہ۔ صفحہ ۹

نفی حکمت مکن از بہرِ دلِ عامے چند

تعظیم و تکریم کلام اللہ کے اگر یہی معنی ہیں کہ بغیر طہارت کے تلاوت نہ کی جائے بے وضو کوئی اس کو چھونے نہ پائے تہ بہ تہ ریشمی جزدان اس پر چڑھے رہیں بے ادبی کے خوف سے رسالوں اور اخباروں میں اس کی آیتیں نہ لکھی جائیں۔ تو کیا اتنا کر لینے سے یہ فرض ادا ہو جاتا ہے؟

فرض کرو ایک شخص کا عمل قرآن پر نہیں ہے اور اس کے کردار و گفتار سے ثابت ہوتا ہے کہ احکام الٰہی کی عزت سے اس کا دل بے بہرہ ہے۔ مگر ظاہری تعظیم میں وہ نہایت مبالغہ کرتا ہے اور ہمیشہ سے جو رسم و رواج چلا آتا ہے۔ اس کے مطابق مروجہ عظمت کا بڑی سختی سے پابند ہے۔ کیا تم ایک لحظہ کے لئے بھی اس کی تعظیم کو قرآن کریم کی اصلی تعظیم پر محمول کر سکتے ہو؟

اصلی تعظیم ظاہر داریوں سے بے نیاز ہے اس کا منشا محض اس قدر ہے کہ آسمانی کتاب جن تعلیمات کو دنیا میں عام کرنا چاہتی ہے اور نوع انسان کی بھلائی کے لئے جو احکام اس نے مقرر کر رکھے ہیں ان کی پابندی کی جائے۔ قرآن اس لئے نہیں اترا تھا کہ لوگ اس کو آنکھوں سے لگانے اور سر پر رکھنے کو کافی سمجھیں قرآن کے نازل ہونے کی خاص غرض یہ تھی کہ دنیا اس کی روشنی سے منور ہو اور اہل دنیا اس کو اپنے معاملات کا دستور العمل بنائیں۔

(۴)

ظاہری عظمت کے لئے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ خود قرآن کریم نے لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۔ پاکوں کے سوا کوئی اس کو چھونے نہیں پاتا، کی تاکید کی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آیت کا مفہوم ہی غلط سمجھا گیا ہے۔ کفار کو اعتراض تھا کہ قرآن منجانب اللہ نہیں ہے۔ یہ بنائی ہوئی باتیں ہیں خدا نے اس وہم کی تکذیب کی اور فرمایا کہ۔

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ ۔ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۔ لَّا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۔ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ اَفَبِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ

یہ قرآن تو بڑی بزرگی کا قرآن ہے۔ محفوظ کتاب میں موجود ہے۔ پاکوں کے علاوہ کوئی اس کو چھونے نہیں پاتا، پروردگار عالم کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ کیا تم اس کلام سے منکر

وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ۔ ہو اور تم نے اپنا راتب باندھ لیا ہے کہ اس کو (سورہ واقعہ۔ رکوع ۳۔ آیت ۸۲) جھٹلاتے ہی رہو گے۔

آیت میں صاف مذکور ہے کہ کفار کو اس پاک کلام کے کلام اللہ سمجھنے سے انکار تھا اور انہوں نے اس کے جھٹلانے کو اپنا فرض قرار دے رکھا تھا۔ جس کے جواب میں بتایا گیا کہ یہ لوح محفوظ میں بڑی احتیاط سے لکھا ہوا موجود ہے۔ اور خدا کے پاک نفس بندوں کے علاوہ کوئی اس کو چھونے تک نہیں پاتا۔ پھر اس میں کمی وبیشی کی گنجائش کہاں رہی۔ اور کوئی اس کو جھٹلا کیونکر سکتا ہے؟

(۵)

اس آیت کی تفسیر میں متعدد حدیثیں مذکور ہیں۔

حضرت ابن عباس و جابر بن زید و ابونہیکؓ سے روایت ہے کہ "وہ قرآن جو آسمان پر ہے پاکوں کے علاوہ کوئی اور اسے نہیں چھو سکتا۔"

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ "مطلب یہ ہے کہ قرآن ایسی محفوظ کتاب ہے کہ اس پر غبار تک نہیں آسکتا۔"

ضحاک کہتے ہیں کہ "کفار کو گمان تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر شیاطین نے قرآن نازل کیا ہے۔ اس کا جواب ملا کہ وہ تو محفوظ کتاب ہے۔ پاکوں کے علاوہ تو اس کو کوئی چھو تک نہیں سکتا۔ وہاں کسی کی دسترس کہاں۔"

سعید ابن جبیر و عیسیٰ ابونہیک و جابر بن زید و مجاہدؒ نے۔ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔ کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ "اس سے مراد فرشتے ہیں۔"

ابوالعالیہ و ابن زید و قتادہ نے روایت کی ہے کہ "یہ مطلب کہ پاکوں کے سوا کوئی قرآن کو چھونے نہیں پاتا۔ اس میں پاکوں سے خدا کے پاک فرشتے۔ مقدس پیغمبر اور پاکیزہ خصال و پرہیزگار بندے مراد ہیں اور قرآن سے وہ قرآن مراد ہے جو لوح محفوظ میں ثبت ہے۔" ورنہ دنیا میں تو اس کو

ناپاک مجوسی اور گندے منافق بھی چھوتے ہیں۔"

اسی طرح کی اور بہت سی روایتیں تفسیر ابو جعفر ابن جریر۔ جلد ۲۷ صفحہ ۱۰۵، ۱۰۶ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

آیت میں نہ صیغۂ نہی وارد ہے اور نہ معنوی نہی کی صورت نکلتی ہے بات صرف اتنی تھی کہ قرآن کریم کے محفوظ و منجانب اللہ ہونیکا یقین دلانا تھا۔

(۶)

ہمارا یہ منشا ہرگز نہیں کہ قرآن کریم کی ظاہری تعظیم ترک کر دی جائے۔ مدعا صرف اس قدر ہے۔

(۱) مسلمانوں کا ظاہر و باطن یکساں ہونا چاہیئے۔ حیف ہے کہ ظاہر میں تو قرآن کریم کا ہم اس قدر ادب کریں کہ جبتک وضو و غسل نہ ہو اُس کو چھُونا اور اُس کے الفاظ کا زبان پر لانا ممنوع سمجھیں اور باطن کا یہ حال ہو کہ تعلیمات قرآنی سے ہماری روش اتنی مخالف ہے کہ گویا دل کو یہ بھی یقین نہیں کہ یہ کلام خدا کا کلام ہے اور اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا ہم پر فرض ہے۔

(۲) اصل تعظیم یہ ہے کہ قرآن کریم کے احکام پر ہمارا عمل ہو، اور ظاہری تعظیم یہ ہے کہ کلام اللہ پر عمل کرنے کے ساتھ کلام اللہ کے مروج احترام میں بھی کوئی دقیقہ رہ نہ جائے باطن و ظاہر دونوں حیثیتوں سے ہم پر یہ دونوں حدیثیں صادق آتی ہیں جن میں ایک سے کان عمله القرآن کی ترغیب نکلتی ہے اور دوسری تخلقوا باخلاق اللہ کی ہدایت کرتی ہے ظاہر ہے کہ اخلاق اللہ سے تخلق بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ہم کلام اللہ سے رجوع کریں اور باطن و ظاہر ہر حیثیت سے اس کی تعظیم بجالائیں۔

(۳) یہ نہایت مخدوش استدلال ہے کہ: "فلاں بزرگ جو تنکا نظر آتا تھا اس کو اٹھا لیتے تھے کہ یہ الف کی شکل اور یہ ب کی صورت ہے۔ فلاں بزرگ نے سن کے کھیت میں داخل ہوتے ہی جوتا اتار لیا کہ اس کا کاغذ بنتا ہے اور اس پر قرآن شریف لکھا جاتا ہے میں اس میں جوتا پہنے کیوں کر چلوں" بے شبہ یہ واقعات

ان بزرگوں کے کمال احترام کا نتیجہ ہیں۔ مگر جہاں وہ اس ظاہری ادب کے پابند تھے وہاں کلام اللہ کی اصلی عظمت بھی ان کے دل میں اس قدر تھی کہ تمام عادات و اطوار اسی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور اسی کے نمونے بنے ہوئے تھے۔

(۴) ظاہری تعظیم (یعنی بے طہارت نہ چھونے) کے لئے قرآن کریم سے جو دلیل پیش کی جاتی ہے اس سے یہ مقصد نہیں ثابت ہوتا۔

(۵) جو لوگ خدانخواستہ آیات قرآنی کی بے حرمتی کرتے ہیں وہ خود گنہگار ہوں گے۔ لیکن اس خوف سے یہ مناسب نہیں کہ مسلمانوں کی تحریر و تقریر میں آیتیں آنے ہی نہ پائیں۔ خدائے تعالیٰ کے احکام میں تو ابھی تک اس ممانعت کی تصریح نظر نہیں آئی۔

(۶) یہ فتویٰ کہ بجائے آیت نقل کرنے کے سورہ و آیہ کا نمبر لکھ کر اس کے ترجمہ کا حوالہ دیدیا کریں شاید ان راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لئے تشفی بخش نہ ہو جن کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے کسی جزو کا ترجمہ بغیر اصل عبارت کے لکھنا اس لئے قابل احتراز ہے کہ ممکن ہے کسی وقت میں یہ رواج عام ہو جائے انجیل و توریت کی طرح قرآن کے لئے بھی لوگ صرف ترجمہ کافی سمجھنے لگیں اور انہیں کی طرح مبادا اس میں بھی تحریف کی گنجائش نکل آئے۔

یہ امر بھی قابل غور ہے۔ کہ کیا تعظیم صرف قرآن کے الفاظ کی ہونی چاہیئے اس کے مطالب کی نہ ہونی چاہیئے۔ لفظ کی عظمت میں اگر معنے کا دخل ہے تو کیا وجہ ہے کہ کلام اللہ کے صرف الفاظ مقدس مانے جائیں۔ لفظ و معنی اگر دونوں مقدس و متبرک ہیں تو کیا یہ جائز ہے کہ آیات قرآنی کے الفاظ تو اس لئے نہ لکھے جائیں۔ کہ ان کی بے ادبی ہوگی اور معانی ترجمہ کرکے اس لئے لکھدیئے جائیں کہ اس کی بے ادبی ہوئی بھی تو کچھ مضائقہ نہیں۔

افکار بشری کی آزادی میں قرآن کا حصہ

(شیخ عبدالعزیز شاویش مرحوم کے خطبات)

(خطبۂ اوّل)

اب سے چند سال قبل مصر کے مشہور فاضل شیخ عبدالعزیز شاویش مرحوم نے مدرسہ دارالعلوم قاہرہ میں عنوان مذکور پر چار خطبات دیئے تھے جن کا ترجمہ صفحات ذیل میں درج کیا جاتا ہے ضروری نہیں ہے کہ شیخ کے تمام خیالات سے ہم متفق ہوں لیکن مجموعی حیثیت سے ہم خیال کرتے ہیں کہ شیخ نے جس پہلو سے قرآن حکیم پر نظر ڈالی ہے اس پہلو پر بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے۔ (ایڈیٹر)

حضرات:

غالباً یہ زیادہ بہتر ہو گا کہ فکر بشری کی تحریک تحریر (آزادی) میں قرآن مجید کے اثر کو بیان کرنے سے پہلے میں آپ کے سامنے ایک مختصر تاریخی بیان پیش کروں جس سے معلوم ہو کہ ظہور اسلام سے پہلے دنیا کی بڑی بڑی قومیں کن انقلابات سے گذری ہیں اور اس کے بعد کئی صدیوں تک قوموں کی عقلوں میں کسی قسم کا مد و جزر اور آزادی و غلامی الٹ پھیر رہا ہے، یہ بیان ہم کو اس بات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے میں مدد دے گا کہ قرآن نے عقل انسانی کو اس کا پورا پورا حصہ دلانے اور اسے اس مقام تک پہنچانے میں کس قدر حصہ لیا ہے جس تک انسان کے خالق نے اوّل آفرینش میں اس کا پہنچنا مقدر فرمایا تھا۔

سلطنت رومیہ (Roman Empire) کے عام سیاسی قانون کی بنیاد، ادیان و عقاید اور افکار کی کھلی ہوئی آزادی پر تھی، اور وہاں یہ حالت برابر قائم رہی، تا آنکہ مسیحی مذہب یورپ میں داخل ہوا، اور اس کے ساتھ

ہی روک ٹوک اور قیود اور بندشوں کا وہ دور شروع ہوا جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

قدیم زمانہ میں بعض شعراء یونان اور مذہبی پیشواؤں کے اثر سے لوگ جن خرافات اور رسوم اور تنگ نظری و تنگ دلی پیدا کرنے والے افسانوں کے جال میں پھنسے ہوئے تھے ان سے افکار کو آزاد کرانے میں سب سے زیادہ جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں ہراقلیتوس (HERACLEITUS) اور دیموقریطس (DEMOCRITUS) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں نے مادۂ طبیعیہ کی تحقیق و تفتیش کے بعد نفس بشری کے احوال اور سیاسی مسائل سے بحث کی، اور اپنی تمام کوششوں اور کاوشوں میں ایک ہی چیز کو اصل الاصول قرار دیا یعنی ہر شے کو عقل اور فکر کی کسوٹی سے پرکھنا۔ یہی طریقہ انکساغورس (ANAXAGORAS) کا بھی تھا۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ یہ سورج جس کی تم صبح شام پوجا کیا کرتے ہو، یہ محض آگ کا ایک تودہ ہے، خدا نہیں ہے کہ اس کی پرستش کی جائے۔

انسانی عقل کو اوہام کی بندشوں سے آزاد کرانے میں ان فلاسفہ نے جو کچھ کیا، اسی نے اُن علماء تربیت کے لئے راہ صاف کی جو صوفیہ یا سفسطائیہ (SOPHISTS) کے نام سے موسوم ہیں، جو پانچویں صدی قبل مسیح ظاہر ہوئے اور جنہوں نے قرن مذکور کے نصف ثانی میں اخلاق و سیاست کے نقطۂ نظر سے حیات اجتماعی کے قواعد و اصول وضع کئے اور غلط و صواب، عقل اور قوانین منطق و خطابت وغیرہ سے بحث کی۔ لیکن یہ سب باتیں ایک بہت ہی قلیل طبقہ علماء اور مفکرین کے طبقہ سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ رہے عوام، تو وہ ہر جگہ خرافات اور باطل عقاید کے دام میں اسیر تھے۔ البتہ اس عہد میں ایتھنز (ATHENS) جس آزادی فکر اور سیاسی مسائل میں بحث و کلام کی حریت سے بہرہ مند تھا، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا خصوصاً ایتھنز کے زعیم حریت پریکلیز (PERICLES) کے عہد میں کہ وہ آزاد مفکرین کا بڑا حامی تھا، اور اُسی کی طاقت نے ایتھنز کے دیوتاؤں سے انکار کرنے والے فلسفی انکساغورس کو قانون کی گرفت سے بچایا۔

اس زمانے کے واقعات و حوادث کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ادیان کے خلاف خروج کرنے والا شخص کبھی نہ بچ سکتا تھا اور اس مضمون میں جو کتاب شائع ہوتی تھی، اس کے نسخے جمع کر کے جلا ڈالے جاتے تھے اور ان کی فروخت کو ممنوع

قرار دیا جاتا تھا لیکن بے دین منطقیوں (RATIONALISTS) کے خلاف جو منظم شورشیں اور باقاعدہ سختیاں پہلے ہوتی تھیں وہ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں کم ہونے لگیں، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اب ان لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور ان کا گروہ پھیلتا جا رہا تھا۔ یونانیوں اور رومیوں کے ہاں ان کی انتہائی علمی تمدنی اور مادی ترقی کے زمانہ میں جو قضایا مسلم تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مطلقاً مذہب عوام کے لئے نافع اور ضروری ہے جو لوگ حقیقت میں مذہب کے قائل نہ تھے وہ بھی سیاست عامہ کے ایک رکن کی حیثیت سے اس کے فائدے کے ضرور قائل تھے۔ کیونکہ ان کے فلاسفر اکثر اس قسم کے عقائد اور نظریات کی اشاعت کا اقدام کر بیٹھتے تھے جو حیات اجتماعی میں اضطراب اور برہمی پیدا کرنے والے ہوتے تھے۔ یونانیوں میں سے جن لوگوں کا قدم اس میدان میں سب سے آگے تھا، ان میں ایک سقراط ہے، جو بجا طور پر ان علماء تربیت میں سب سے زیادہ جلیل القدر سمجھا جاتا ہے۔ جس چیز نے اس کو ممتاز اور یکتائے روزگار بنا دیا تھا۔ وہ یہ تھی کہ وہ نکتہ چینی اور مناقشہ کے طریق میں نہایت مضبوط تھا اور جو لوگ اس سے گفتگو کرتے یا اس کا کلام سنتے، ان کو اپنے زور تقریر سے اس نقطہ پر کھینچ لاتا تھا کہ معروف و مقبول عام عقائد کو بغیر جانچے پرکھے تسلیم نہ کریں، ان کو عقل و فکر کی کسوٹی پر کس کر دیکھیں رسوم و تقالید کی بندشوں میں بندھے نہ رہیں عوام کی خواہشوں اور رغبتوں سے بے پرواہ ہو جائیں اور ہر بحث و تحقیق کے لئے اپنے سینے کو کشادہ کر لیں سقراط نے علم کی اشاعت اور تلاش حق اور فکر صحیح کے طریقوں کی جانب اپنے عہد کے نوجوانوں کی رہنمائی کے لئے یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا تھا کہ پانچویں صدی قبل مسیح کے وسط میں یونان ایک ایسی فکری حرکت کا میدان بنا ہوا تھا جس کی ابتدا کرنے والے یا تو پیٹ کا دھندا چاہتے تھے یا شہرت و نام وری کے طالب تھے۔ ان لوگوں نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے جدل و تشکیک کے طریقوں میں غلو کی انتہا کر دی تھی، اور ان کو اس کی کچھ پرواہ نہ رہی تھی کہ ان طریقوں سے لوگ کس قدر گمراہ ہوں گے اور اس کے کیسے برے نتائج ظاہر ہوں گے ان لوگوں نے حق اور باطل، فضیلت اور رذیلت کو ایسا گڈمڈ اور غلط ملط کیا کہ لوگوں کے لئے صحیح اور غلط میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا، اور علم صحیح کے نشانات دیدہ و دل نگاہوں سے چھپ گئے انہوں نے فکر و نظر کے

شعبوں میں سے کوئی شعبہ اور معرفت کے میدانوں میں سے کوئی میدان نہ چھوڑا جس کے اساس وارکان میں تشکیک کے تیشے نہ چلائے ہوں نہ اس غرض سے کہ کسی علمی فائدے تک پہنچیں، یا صحیح نتائج حاصل کریں، بلکہ محض بھٹکنے اور بھٹکانے کے لئے، محض جاہل بننے اور بنانے کے لئے۔

پس جب سقراط عقل زریں رائے سدید اور علم صحیح لے کر آیا تو اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق کلام کرے اور اُن کی رہنمائی کے لئے اسی راستہ پر چلے جس پر دوسرے لوگ ان کو گمراہ کرنے اور ان کو بھٹکانے کے لئے چلتے تھے۔ اگر وہ ان کی تعلیم وارشاد میں ان راہوں سے الگ کوئی راہ اختیار کرتا جن کے وہ لوگ گردیدہ ہو چکے تھے، تو وہ نہ ان کو اپنے طریقہ کی طرف کھینچ سکتا اور نہ اپنے مقاصد میں کوئی کامیابی حاصل کر سکتا۔ سقراط کے زمانہ تک تربیت عالیہ کو یونان کے سیاسیین اور مفکرین کے مقاصد میں شامل ہونے کا شرف حاصل نہ ہوا تھا، باوجودیکہ ایتھنز اس عہد میں اپنی جمہوریت اور رواداری اور آزاد خیالی کے لئے تمام دنیا میں مشہور تھا۔ مگر تاریخ ہمکو حریت فکر کی طرف دعوت دینے والوں اور عقل سے فیصلہ چاہنے والوں کے خلاف اہل ایتھنز کے ظلم وستم کی وہ وہ داستانیں سناتی ہے جن کے باور کرنے سے وہم انکار کرتا ہے۔ سقراط مناظرہ ومجادلہ اور تشکیک ونقد کے فن میں پرلے درجہ کا ماہر تھا، اور لوگوں کے رسوم وعقاید کی پابندیوں سے اس کی آزادی مشہور تھی اس کے مقابلے میں یونانیوں کے اندر ایک ایسی روح کام کر رہی تھی جو جدید عقلی زندگی کی دشمن تھی۔ وہ فلاسفہ اور ان کے سردار سقراط سے جنگ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے جھوٹے قصے گھڑ کر ان کو بدنام کیا، ان کا مذاق اڑایا سقراط جیسے شخص کو زندیق، بدعمل اور گمراہی کی طرف بلانے والا مشہور کیا، یہاں تک کہ یونانی قوم اس کے خلاف بھڑک اٹھی اور اس کو ملحد اور نوجوانوں کے عقاید خراب کرنیوالا قرار دیکر ۳۹۹ قبل مسیح میں قتل کر دیا۔ اسے نوجوانوں کے عقاید خراب کرنے کا الزام تھا۔ اس کو رد کرتے ہوئے اس نے دو باتیں پیش کی تھیں:۔

۱۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ جب وہ دیکھے کہ اس پر ظلم کیا جا رہا ہے تو اس کا مقابلہ کرے، خواہ نتیجہ مخالف ہو یا موافق اور چاہے وہ ظلم کرنے والا کوئی صاحب ثروت آدمی ہو، یا کوئی محکمہ ہو۔

۲۔ اپنی بات سے ہرگز نہ ٹلے کیونکہ آزاد مباحثہ میں بڑی مصلحت ہے اور یہی چیز علم صحیح کی ضامن ہے۔ اس کے ۷۰ برس بعد ارسطو کو بھی اسی انجام کے خوف سے ایتھنز چھوڑنا پڑا، کیونکہ وہاں اس کو بھی ملحد شمار کیا جانے لگا تھا۔

سقراط کے سب سے زیادہ جلیل القدر شاگرد افلاطون نے ایک نئی ضرب لگائی جس نے حریت فکر و مباحثہ کی جانب پیشقدمی کو رجعت سے بدل دیا وہ اپنی مثالی ریاست (Ideal state) میں لوگوں کو ایک خاص دین قبول کرنے پر مجبور کرتا ہے، جس کا خاکہ خود اس نے پیش کیا ہے جو کوئی اس دین پر ایمان نہ لائے افلاطون اس کو قتل اور قید کی سزا دینا چاہتا ہے۔ وہ گفتگو اور مباحثہ کی آزادی کو بھی سزاؤں سے روکتا ہے جو اس نے اپنی کتاب میں تجویز کی ہیں۔

سقراط کی تعلیمات ایک ایسا سرچشمہ تھیں جس سے فلسفہ کے متعدد مذاہب رونما ہوئے اور فلاسفہ کا ایک ممتاز گروہ پیدا ہوا جن میں افلاطون اور ارسطو اور رواقیہ (Stoics) وغیرہ شامل ہیں جن کے مذاہب تیسری صدی قبل مسیح سے بلاد یونان کے اطراف میں پھیلنے شروع ہوئے، اور جنہوں نے عقلی زندگی کے دروازے کھول دیئے اور اہل یونان میں فکر و تدبر کی قابلیت پیدا کی۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل بیان ہے کہ گو ابیقورس (Epicurus) اس وجود میں تدبیر و تصرف کرنے والی خدائی حکومت کا منکر تھا، اور اس کی نظر مادہ اور مادیات کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکی تھی مگر اس کے باوجود وہ جدت فکر کی دشوار گذار گھاٹیوں سے اس حیرت ناک سرعت کے ساتھ گذرا کہ سوتی ہوئی عقلیں چونک پڑیں اور صدیوں تک زمانہ اس کے اثر کو نہ مٹا سکا۔ حتیٰ کہ ایک رومی شاعر کو تو اس کے فلسفہ میں وحی و الہام کا جلوہ نظر آیا جس کو اس نے اپنے قصیدہ "طبیعۃ الدنیا" نامی میں بیان کیا ہے۔

انسانی عقل کی آزادی میں رواقی فلسفہ کا بھی کچھ کم حصہ نہ تھا بلکہ درحقیقت اس مذہب نے ان قوانین اجتماعیہ کو ایک منظم اور مفصل طریق پر پیش کیا، جن کا سقراط نے کچھ بھی ذکر نہ کیا تھا رواقی فلسفہ نے رومی

قوانین پر خاص اثر کیا، کیونکہ رومی سلطنت کے قانون مدنی کی بنیاد تمام ادیان کی کھلی ہوئی آزادی اور اظہار رائے کی پوری حریت پر تھی، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

(خطبہ دوم)

حضرات!

رومی سلطنت اسی آزادی فکر اور حریت دینی کے قانون پر چل رہی تھی، کہ مسیحی مذہب یورپ پہنچا، اور رومی قوم نے اپنی صنم پرستی کی حفاظت کے لئے مذہبی آزادی کے اصول کو خیرباد کہدیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ رومی اس مذہب کو یہودیت کی ایک شاخ سمجھتے تھے، اور یہودیت بالطبع رومیوں کے دینی عقاید کی مخالف تھی اور رومیوں کو ایک آن نہ بھاتی تھی، یہودیت اور اس کے شبہ میں مسیحیت سے رومیوں کی شدید نفرت اور بغض کا نتیجہ یہ ہوا کہ تراجان (TRAJAN) نے ان لوگوں کے قتل کا حکم دے دیا جو دین نصرانی کے پیرو تھے اگرچہ اس کے ساتھ ایسی قیود بھی عاید کر دیں کہ حد سے زیادہ قتل عام نہ ہونے پائے لیکن بعد میں قیصر ڈیوکلیتیان (DIOCLETIAN) نے حکومت کے مذہب کی تائید کرنے کا عزم کر لیا اور پوری سنگدلی اور فساد کے ساتھ مسیحیوں کا قتل عام کرایا۔ درحقیقت جس چیز نے اس فرمانروا کو ان جرائم پر آمادہ کیا وہ یہ تھی کہ مسیحیت رومیوں کی اس عبادت کی مخالف تھی جس کا مرکز رومن ایمپائر کا تخت تھا بخلاف اس کے رومی فرمانروا اس کو ضروری سمجھتے تھے، کہ قومیں ان کو اپنی عبادت کے لئے مخصوص کر لیں تاکہ ان کی وحدت قومی باقی رہے اور اس تخت سے انکا خالص تعلق قائم رہے جو پوری سلطنت کا مرکز ہے۔

لیکن قسطنطین اعظم کے نصرانیت میں داخل ہوتے ہی نقشہ بدل گیا۔ اس سے پہلے دو صدیوں تک مسیحیت کے پیشوا یہ اعلان کرتے رہے تھے کہ مذہبی رواداری واجب ہے اور عقاید وہ چیز نہیں ہیں جو زبردستی انسان کے سر چپکی جا سکتی ہو، مگر قسطنطین کا مسیحیت میں داخل ہونا تھا کہ سرے سے یہ سب اصول پلٹ گئے۔ اب حکام اور فرمانروا بشیتر سیاسی اغراض کے لئے، اور عوام کے مختلف گروہ آپس کے مذہبی اختلافات کی بنا پر فتنوں کے شعلے بھڑکانے لگے جگہ جگہ ہولناک قتل عام برپا کرنے لگے، دنیا سے امن و سلامتی رخصت ہوگئی دلوں سے راحت و اطمینان کی متاع چھن گئی۔

ان کی تعلیم یہ تھی کہ نجات مسیحیت قبول کئے بغیر ہو نہیں سکتی، اور جو اس کو قبول نہ کرے اس کو کوئی فدیہ نہ عذاب نیا سے بچا سکتا ہے اور نہ عذاب آخرت چاہے اس میں کیسے ہی فضائل ہوں اور اس نے کیسے ہی نیک کام کئے ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ اگر بچہ بپتسمہ لئے بغیر مر جائے تو وہ آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ پیٹ کے بل دوزخ کی زمین پر گھسٹتا رہے گا، ان کے مقدس ترین آدمیوں میں سے ایک سینٹ اگسٹائن (ST. AUGUSTINE) متوفی ۴۳۰ء نے نصرانیت قبول نہ کرنے والوں پر جبر و ظلم کرنے کے لئے ایک نظام مقرر کیا تھا جو اس کے بعد بارہویں صدی تک مسلسل چلتا رہا جب کبھی نصاریٰ کے درمیان کوئی بدعت رونما ہوتی یا کوئی ایسا عقیدہ نکلتا جو چرچ کے نفوذ و اثر کو کم کرنے والا ہوتا، تو اس عقیدہ کے پیروؤں پر پادریوں کی طرف سے سختیاں کی جاتیں اور ان کو سزائیں دینے میں انتہائی مبالغہ کیا جاتا تھا، پوپ انوسنٹ سوم (INNOCENT) نے کونٹ طولوز کو حکم دیا کہ اپنی رعایا میں سے اس گروہ کا استیصال کر دے جس پر مذہبی بدعت کا الزام تھا، اور جب کونٹ نے اس کا حکم نہ مانا تو پوپ نے اس کے خلاف صلیبی جہاد کیا جس میں اس کی قوم فنا ہوتے ہوتے رہ گئی، کونٹ کی املاک ضبط کی گئیں اس کی شوکت مٹا دی گئی، اور پوپ نے اس سے اس وقت تک صلح نہ کی جب تک کونٹ نے اپنے ملک سے اس مذہب کا کلی استیصال کر دینے کی شرط نہ مان لی۔

اس طرح ۱۲۳۳ء میں ملحدین کی تحقیقات کے لئے نظام تفتیش (INQUISITION) قائم کیا گیا، اس کی تنظیم پوپ انوسینٹ چہارم کے عہد میں ۱۲۵۲ء میں مکمل ہوئی۔ تمام نصرانی ممالک میں اسے پھیلایا گیا۔ پادریوں کو اس میں مفتش مقرر کیا گیا۔ پاپاؤں کی جانب سے ان کو مطلق اختیارات عطا کئے گئے جن کے استعمال میں ان سے کوئی بازپرس نہ کی جاتی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی نصرانی سلاطین نے بھی ملحدوں کو سزائیں دینے کے لئے سخت ظالمانہ قوانین مقرر کئے۔ باوجودیکہ فریڈرک دوم (FREDERICK) نہایت آزاد خیال شخص تھا لیکن اس نے بھی ایک حکم صادر کیا کہ جو کوئی نصرانیت میں کوئی بدعت نکالے، وہ دین سے خارج سمجھا جائے، اگر توبہ نہ کرے تو جلا دیا جائے اگر توبہ کرے تو قید کیا جائے۔ اور اگر توبہ سے پھر جائے تو قتل کر دیا جائے اور بہر صورت ان سب کی املاک ضبط کی جائیں اور ان کے گھر ڈھا دیئے جائیں۔ ان کے بچے اور عورتیں تک رحم کے مستحق نہیں ہیں، اگر وہ ملحدین و مبتدعین کی

مخبری نہ کریں رہا ہے وہ ان کے باپ ہی کیوں نہوں، توان کے ساتھ بھی وہی سختی کا برتاؤ کیا جائے۔ فریڈرک نے الحاد اور بدعت کے لئے سولی کی سزا مقرر کی تھی یہ حکم اٹلی اور جرمنی میں ۱۵ سال تک ۱۲۲۰ء سے ۱۲۳۵ء جاری رہا۔

پھر نظام تفتیش تمام مغربی یورپ میں پھیل گیا۔ ہنری چہارم وپنجم کے زمانہ میں انگلستان میں بھی الحاد کی سزا سولی سے دی جاتی تھی، یہ قانون ۱۴۰۰ء میں جاری ہوا، ۱۵۳۳ء میں منسوخ ہوا پھر دوبارہ ملکہ میری کے عہد میں جاری کیا گیا اور ۱۶۷۶ء میں آخری مرتبہ منسوخ ہوا لیکن مسلمانوں اور یہودیوں کے خلاف بدترین وحشیانہ طریقوں کے ساتھ اس قانون کو برابر جاری رکھا گیا، اور اس کی قانونیت انیسویں صدی میں منسوخ کی گئی۔ اس دوران میں یہ قانون ان مسلمانوں اور یہودیوں پر نافذ کیا جاتا تھا جن پر ارتداد کا الزام ہوتا تھا، مختصر یہ کہ نظام تفتیش نے یہ قاعدہ کلیہ مقرر کر رکھا تھا کہ "سو بے گناہوں کا قتل کیا جانا اس سے بہتر ہے کہ ایک شخص الحاد کرے" اس قاعدہ کے مطابق وہ کم سے کم شبہ کی بنا پر بھی لوگوں کو قتل کرتے اور جلا ڈالتے تھے، اور کسی کو اپنی طرف سے مدافعت پیش کرنے کا حق نہ تھا، اور نہ کوئی محکمہ کسی حال میں تردیدی شہادت قبول کرتا تھا، چنانچہ پوپ الیگزنڈر ہشتم نے ۱۴۸۴ء میں اعلان شائع کیا کہ طاعون اور آندھیوں کا آنا دراصل جادوگروں کے عمل کا نتیجہ ہے، لہذا ہر جگہ ان کو تلاش کرو اور جہاں ملیں بری طرح مارو اور قتل کرو۔ یہ حکم خصوصیت کے ساتھ انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ میں زیادہ زور کے ساتھ نافذ کیا گیا۔

بارہویں صدی کے آخر میں ایک دوسری دنیا سے اہل یورپ کی عقلوں کے لئے ایک نئی روشنی پہنچی تاکہ انہیں ان بندشوں اور بندھنوں سے آزاد کرائے جن میں وہ جکڑی ہوئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی یورپ میں اہل عرب کے واسطے سے فلسفہ ارسطو کی تعلیم پھیل رہی تھی۔ یورپ والوں کی عقلوں کو آزاد کرانے میں ابن رشد اور اس جیسے دوسرے فلاسفۂ اسلام کا بڑا حصہ ہے اور ان کی تعلیمات کے اثر کو مٹانے اور ان کا مقابلہ کرنے میں پاپاؤں کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے پوپ یوحنا یازدہم ابن رشد کی تعلیمات کی سخت برائی کرتا تھا۔ اور اس کے وجود اور اس کی اشاعت کو حد درجہ مضر بتاتا تھا، جنوبی اٹلی میں سینٹ طامس اکون نے ۱۲۷۳ء میں

ارسطو اور مسلمانوں کے فلسفہ کے مقابل کنیسہ کے لئے ایک فلسفہ ایجاد کیا جس پر اب تک رومن کیتھولک چرچ قائم ہے۔ اگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے فلسفہ میں انسانی عقل کو کوئی جائے قرار نہیں ملتی بلکہ وہ اسے ایک تنکے کی طرح ہوا میں اس طرح اڑائے ہوئے پھرتا ہے کہ کہیں وہ ٹھہر نہیں سکتا۔

مورخین کا اس پر اجماع ہے کہ حرکت فکری اور نہضت علمی یورپ میں بارہویں صدی عیسوی کے قریب دو راستوں سے داخل ہوئی: ایک وہ تصادم جو دو صدیوں تک صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں فرنگی اقوام اور اسلامی مشرق کے درمیان ہوتا رہا دوسرے وہ معاہدہ علمیہ جو عربوں نے اندلس نیپلز اور صقلیہ میں قائم کئے۔ اور محقق مورخین یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ یورپ میں جن لوگوں سے نہضت علمیہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے، مثلاً راجر بیکن وغیرہ، وہ عربی زبان جانتے تھے اور لاطینی سے بھی واقف تھے جس میں قریب قریب ہر فن کے متعلق عربوں کے علوم ومباحث منتقل ہو رہے تھے۔ جہاں کہیں ان لوگوں نے ایجاد وابداع کے شرف کا دعویٰ کیا ہے، یا یہ شرف ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ انہوں نے عمداً وہ مصادر چھپائے ہیں جہاں سے مسائل انہوں نے اخذ کئے اور اپنے بنا کر پیش کر دیئے۔ ائمۂ تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ انگریزی راہب راجر بیکن نے جس کی طرف اہل فرنگ عدسات ونظارات (OPTIOS) میں سبقت کا شرف منسوب کرتے ہیں "یہ مسائل ابن الہیثم سے اخذ کئے تھے جو طبیعات اور خصوصاً نور اور بصریات کے مسائل میں اہم مباحث لکھ گیا ہے۔ پس وہ اہل قرآن ہی تھے جن کے ساتھ ربط وتعلق نے اہل یورپ کی آنکھیں کھولیں ان کی بصیرت پر سے جہالت کے پردے ہٹائے، اور صدیوں کی چھائی ہوئی تاریکی سے ان کو نکالا اگر مغرب کے باشندے اس وقت ہر حیثیت سے اسی مرتبۂ عقلی پر ہوتے جس پر اہل قرآن تھے، تو عربی تمدن اور اسلامی حریت فکر سے رابطہ قائم ہونے کے بعد ان کی فکری بیداری میں ذرا سی بھی تاخیر نہ ہوتی لیکن اس زمانے میں مذہبی پیشواؤں کی گرفت ایسی مضبوط تھی اور مسیحی دنیا کی عقلیں کچھ اس طرح ان کی غلامی میں پھنسی ہوئی تھیں کہ اسلامی تمدن کے اثرات پوری قوت کے ساتھ آگے نہ بڑھ سکے۔ جو فلسفہ ان کے ہاں پہنچا اس کا رخ مذہبی پیشواؤں نے دینی مباحث کی طرف پھیر دیا اور کنیسہ کی چار دیواری میں اس کو مقید کر دیا۔

اور اس طرح اس کی غایت طبیعی تک نہ پہنچنے دیا۔

۱۵۲۰ء میں کیتھولک چرچ کی جانب سے اس مضمون کا جو فرمان جاری کیا گیا تھا کہ تمام مجادلات سے پرہیز کیا جائے اور تورات وانجیل کی تفسیر بجز اس طریقہ کے کسی اور طریقہ سے نہ کی جائے جو کنیسہ نے مقرر کردیا ہے، اس نے نصرانی قوموں میں عام ناراضی پھیلا دی تھی اور یہ حکم من جملہ ان اسباب کے ایک بڑا سبب تھا جن کی بدولت پراٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوا لیکن اس کے باوجود اسی پراٹسٹنٹ مذہب کے بانی لوتھر نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ حکومت، قوم کو وہ عقیدہ اختیار کرنے پر مجبور کر سکتی ہے، جسے وہ صحیح سمجھتی ہو اور اسے حق ہے کہ ملحدوں اور اس عقیدہ کا انکار کرنے والوں کا استیصال کردے اسی قسم کے عقل کش قواعد و اصول تھے جنہوں نے ایک مدت تک حرکت فکریہ کو اپنی اصلی رفتار پر نہ چلنے دیا۔

آخرکار سولہویں صدی کے اواخر میں انگلستان کا فلسفی فرانسس بیکن ظاہر ہوا جس نے فلسفہ دینی پر زبردست حملے کئے اس کے عالیشان قصر کو دلائل کے تیشوں سے ڈھا کر رکھ دیا۔ لوگوں کو عقلی آزادی کی طرف دعوت دی، اور علمی مسائل پر جدید اساس سے بحث کرنے کی بنا ڈالی علمی تحقیق کرنے والوں نے اس کی رہنمائی کو قبول کیا اور اس وقت سے تجدید علمی اور تجرید عقلی کا وہ دور شروع ہوا جس کے ثمرات سے اب تک مشرق و مغرب متمتع ہو رہے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ یورپ میں تاریخ فلک جدید کی ابتدا ۱۵۴۳ء سے ہوئی ہے یہ وہ زمانہ ہے جب کوپرنیکس (COPERNICUS) کی کتاب شائع ہوئی جس میں اس نے سورج کے گرد زمین کا گھومنا ثابت کیا تھا پھر گیلیلیو (GALILEO) نے اپنی دوربین کے ذریعہ سے مریخ کے چاند ثابت کئے اور یہ بھی ثابت کیا کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے پھر کنیسہ نے ان اکتشافات کا استقبال کس طرح کیا؟ فروری ۱۶۱۶ء میں مکتب مقدس نے فیصلہ کیا کہ کوپرنیکس کا مذہب نہایت رکیک ہے، اسے مسیح کی وصیت کے مطابق بدعتی ٹھیرایا گیا اور اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط تک مدرسہ نظام شمسی کی تسلیم سے محروم رکھا گیا اس مخالفت نے اٹلی میں علوم طبیعیہ کی ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا اسی طرح پوپ الکزینڈر نے ۱۵۰۱ء میں مطابع پر نگرانی قائم کردی تاکہ ایسے آزاد خیالات جن کو کنیسہ پسند نہ کرتا ہو شائع نہ ہونے پائیں، چاہے وہ ثابت شدہ علمی حقائق ہی کیوں نہ ہوں۔ فرانس میں ہنری دوم

نے اس شخص کے لئے قتل کی سزا مقرر کی تھی جو کوئی چیز بلا اجازت طبع کرے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے کسی حصہ میں پریس کو انیسویں صدی سے پہلے آزادی نصیب نہیں ہوئی یہی زمانہ ہے جس میں کنیسہ کا اقتدار ضعیف ہوا۔ اور ملوک و امرا و مدنیت کا اقتدار بڑھا اور دستوری نظم و قوانین کا چرچا ہوا۔ فرانس میں جمہوری حکومت قائم ہوئی ۱۷۹۲ء تو پاپ کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ کنیسوں کے خلاف ایک زبردست حرکت شروع ہوئی۔ پیرس میں تمام معابد کو بلا استثنار بند کر دینے کا حکم دے دیا گیا پھر جب پیس پیر (ROBESPERRE) برسر حکومت آیا تو اس نے طے کیا کہ حکومت کا مذہب بزرگ و برتر کی عبادت ہو۔ اس کے تھوڑی مدت کے بعد ایک نیا دین ایجاد کیا گیا جس کا نام دین فطرت تھا، اور یہ اس صدی کے فلاسفہ اور شعرار مثلاً والٹیر (VOLTAIRE) وغیرہ کا مذہب تھا۔ اس کے قواعد یہ تھے کہ خدا اور بقار روح کا اعتقاد رکھو، اور اخوت و انسانیت در رحمت کو شیوہ بناؤ، ورنہ اس دین کی دوسرے ادیان و مذاہب کشمکش برپا ہو جائے گی۔ اس نئے مذہب کو دین محبت الٰہی (THE CPHILANTHROPY) کے نام سے موسوم کیا گیا۔ مگر ۱۸۰۱ء میں نپولین نے اس مذہب کا تختہ الٹ دیا اور پاپائیت دوبارہ میدان میں آگئی۔ اس حرکت سے نپولین کا مقصد بجز اس کے کچھ نہ تھا، کہ روحانی اقتدار فائدہ اٹھائے اور آئندہ کی لڑائیوں میں اس سے کام لے اور کیتھولک دنیا میں اپنی سلطنت وسیع کرے۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں بہت سی مسیحی جماعتوں کا عقیدہ اس وجہ سے متزلزل ہو گیا کہ اس زمانہ میں یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ تورات اور انجیل کے بیانات میں تضاد اور اختلاف ہے جس کو قبول کرنے سے عقل انکار کرتی ہے۔ اس سے انکار وحی کا خیال پیدا ہو گیا اور جگہ جگہ علمی مناقشات ہونے لگے انیسویں صدی میں قدیم رسوم و عقائد کے خلاف زیادہ منظم حملے ہوئے اور ان میں سے اکثر کی جڑیں اکھاڑ پھینکی گئیں۔ اگرچہ اس زمانے کے علمار میں خود بھی باہم اختلاف تھا۔ بعض کھلم کھلا ان تقالید کے منکر تھے اور ان کو غیر معقول اور رکیک سمجھتے تھے، اور بعض اس حد تک نہیں پہنچے تھے۔ فرانسیسی عالم پاسکل (PASCAL)

ان پر ایمان رکھتا تھا۔ انگریز فلسفی لیکن ظاہر میں لاہوتیت کا اعلان کرتا تھا۔ مگر دل میں الحاد چھپائے ہوئے تھا۔ دوسری طرف ڈیکارٹ (RENE DESCARTES) کوشش کر رہا تھا کہ عقل اور کنیسہ میں موافقت پیدا کرے۔ اس زمانہ میں بسا اوقات ہم کو کنیسہ پر عقل کا غلبہ علانیہ نظر آتا ہے۔ مثلاً جادوگروں کے معاملہ میں یا تو ہم یہ دیکھ رہے تھے کہ ۱۶۱۲ء میں جیمز اول انجیل کی آیت "تو جادوگر کو زندہ نہ چھوڑ" کے مطابق عمل کر کے ان مسکینوں سے نہایت سختی کے ساتھ پیش آ رہا ہے یا دوسری طرف ہمکو یہ نظر آتا ہے کہ ہرٹفورڈ شائر کی ایک جادوگرنی کو جیوری سزائے قتل کا مستحق قرار دیتی ہے مگر جج ان کی بات کو قبول نہیں کرتا اور کنیسہ کی تعلیمات اور عام رسم کو نظر انداز کر کے اسے رہا کر دیتا ہے اگرچہ انگلستان میں ساحر کے قتل کا قانون ۱۷۳۶ء میں منسوخ ہوا لیکن اس کے بعد بھی ۱۷۵۱ء میں اسکاٹلینڈ کی ایک عورت اس الزام میں زندہ جلائی گئی۔

قابل ذکر مذاہب میں سے ایک وہ ہے جس کی بنا ہالینڈ کے یہودی فلسفی اسپینوزا (SPINOZA) نے رکھی اس کا عقیدہ یہ تھا کہ عالم کا ایک خدا ہے جو اپنی ذات سے قائم ہے اور یہ کہ انسان اپنے ارادہ میں آزاد نہیں ہے اور علت اولی یا علت العلل کا اعتقاد خرافات میں سے ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ وحدت الموجود یا وحدت الوجود کا اعتقاد رکھتا تھا، یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ کلمہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں آزاد مفکرین کے رموز میں سے تھا، کیونکہ اس پر عالم غضب اور تکفیر کا طوفان برپا ہو جاتا تھا اس کا اظہار صرف دقیق کتابوں ہی میں کیا جا سکتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں جتنے لوگ آزاد خیال کہے جا سکتے تھے وہ سب کے سب الٰہیین تھے، جو خدا پرستی کے تو قائل تھے مگر وحی کو نہ مانتے تھے۔

اسپینوزا کے معاصرین میں سے ایک لوک (LOCKE) ہے جس کی کتاب (ESSAY ON THE HUMAN UNDERSTANDING) کا لب لباب یہ ہے کہ علم کلیتہً تجربات کا نتیجہ ہے بہر حال میں اعتقاد کو حکم عقلی کے تابع ہونا چاہئے جو چیز حکم عقلی کے خلاف ہو اس کے ماننے سے انکار کر دو خواہ وہ وحی ہی کیوں نہ ہو جو علم صحیح نظر عقلی سے حاصل ہوتا ہے وہ وحی سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس نے ایک کتاب نصرانیت کو عقل کے

مدانق بنانے کے لئے بھی لکھی تھی اسی ڈھنگ پر اس کا معاصر بایل بھی چلا جس نے فرانس سے جلاوطن ہوتے
کے بعد ہالینڈ میں اپنی کتاب القاموس الفلسفی (PHYLOSOPHICAL DICTIONARY) مرتب کی۔ وہ کہتا ہے
کہ اعتقاد کی فضیلت بس اس میں ہے کہ خدائے واحد کی قدرت اور اس کی فرمانروائی پر ایمان رکھو۔ ایک اور
موقع پر کہتا ہے کہ "الہیین کے لئے آرتھوڈوکس مذہب کے خدا کی صفات کو اس خدا کی صفات سے تطبیق دینا
محال ہے جس کا وجود عقل سے ثابت ہوتا ہے" مگر جب آرتھوڈوکس لوگوں میں سے ایک فریق نے عقل کو حکم
بنانا قبول کیا تو وہ گمراہ ہو گئے اور ان میں سے اکثر الحاد کے گڑھے میں جا پڑے۔ الہیین اور اسپینوزا
اس امر میں متفق ہیں کہ آسمانی کتابوں کی تفسیر بھی اُس طرح ہونی چاہئے جس طرح دوسری کتابوں کی ہوتی ہے

سترہویں صدی کے آخر تک الہیین کے خیالات پوشیدہ رہے، پھر جب قوانین مطبوعات منسوخ ہو گئے
انہوں نے کچھ کچھ اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا۔ پوری آزادی اب بھی نہ تھی کیونکہ اب بھی چند مزاحمتیں باقی تھیں۔
مثلاً مذہبی پیشواؤں کو حق تھا کہ جو کوئی مسیحی تعلیمات پر اعتراض کرے یا ان کی تقالید کے خلاف رائے ظاہر کرے
یا منع پر حرف گیری کرے اسے قید کر دیں۔ انگلستان کے لارڈ چیف جسٹس ہیل (SIR MATHEW HALE)
نے ۱۶۷۶ء میں قانون عام کی یہ تعبیر کی کہ ہر وہ عمل یا قول جو کنیسہ کی تعلیم کے خلاف ہو، قانون عام کے خلاف
ہو، قانون عام کے خلاف سمجھا جائے گا۔ کیونکہ نصرانیت انگریزی قانون عام کے ارکان میں ہے۔ ۱۶۹۸ء کے
قانون عام میں یہ تصریح کی گئی کہ کسی نصرانی کے لئے کنیسہ کے اصول اور اس کی تعلیمات کے خلاف رائے ظاہر کرنا جائز
نہیں ہے جو کوئی ایسا کرے گا اس کو پہلی مرتبہ خدمت سے محرومی کی سزا دی جائیگی اور دوسری مرتبہ عام مدنی حقوق سے محروم کر دیا جائیگا

اٹھارہویں صدی میں والٹیر اور روسو (ROUSSEAU) نے آزادی فکر کی تحریک کا بیڑا اٹھایا۔ موخر الذکر
کی کتاب امیل (EMILE) علانیہ پیرس میں جلائی گئی اور حکومت نے اس کے مؤلف کی گرفتاری کا حکم صادر کیا، تمام
یورپ میں فریڈریک شاہ پروشیا کے سوا کسی نے اس کو پناہ نہ دی۔ مگر وہاں بھی مذہبی پیشوا اس کے پیچھے پڑے
رہے یہاں تک کہ اسے پروشیا سے بھی نکلنے پر مجبور کر دیا۔ روسو نے اپنی کتاب العقد الاجتماعی (SOCIAL CONTRACT)

میں جو اشتراکی نظریات بیان کئے ہیں ان کا حیات اجتماعی پر بڑا اثر ہوا ہے۔ لیکن یہی کتاب اس زمانہ میں علانیہ جنیوا میں جلائی گئی تھی۔

۱۷۷۰ء میں جرمن نژاد بیرن دی ہولباخ (HOLBACH) کی کتاب نظام طبیعت (SYSTEM OF NATURE) شائع ہوئی جس میں اس نے خدا کے وجود اور بقائے روح سے انکار کیا تھا تو تمام فرانسیسی ناظرین گھبرا اٹھے تھے۔ غرض اٹھارہویں صدی میں گو اس تحریک کی مخالفت پوری قوت پر تھی لیکن الحاد اور آزاد خیالی اس کے علی الرغم پھیلتی چلی گئی۔

انیسویں صدی تک بھی مذہب اور آزاد خیالی میں کشمکش برپا رہی۔ چنانچہ ۱۸۱۹ء میں جب کارلائل کی کتاب عصر العقل (THE AGE OF REASON) شائع ہوئی تو اُسے تین سال کے لئے قید کی سزا دی گئی۔ پھر اسی کتاب کی بدولت اس کی بیوی، بہن اور بہت سے کتب فروشوں پر مقدمہ چلایا گیا۔

غرض اٹھارہویں صدی کے وسط تک اہل یورپ کی عقلیں قدیم تقالید کی بندشوں میں بُری طرح جکڑی رہیں اس زمانہ میں کیفیت یہ تھی کہ فریڈرک شاہ پرشیا کے باپ نے فیلسوف وولف (WOLFE) کو صرف اس جرم میں نکال دیا کہ اس نے کنفیوشس کے مذہب کی تعریف کی تھی۔ گویا اس فرمانروا کی رائے میں کسی شخص کو نصرانیت کے سوا کسی مذہب کی تعریف کرنے کا حق ہی نہ تھا" مگر اسی باپ کے بیٹے نے اپنے ملک کو تمام ان لوگوں کے لئے جائے پناہ بنایا جو دوسرے ممالک میں حریت فکر کی بنا پر ظلم و ستم کا تختہ و مشق بن کر بھاگتے تھے ۱۷۸۱ء میں کانٹ (KANT) نے اپنی کتاب عقل صحیح (CRITIC OF PURE REASON) لکھ کر دنیا بھر میں ہلچل برپا کر دی اس نے رائے ظاہر کی کہ اس کائنات سے خدا کے وجود پر استدلال کرنا غلط ہے۔ اور بقائے روح پر جتنے دلائل قائم کئے گئے ہیں باطل ہیں اور دعویٰ کیا کہ علم کے لئے تجربہ کے سوا کوئی مصدر نہیں ہے لیکن آخر میں اس نے ایک اور کتاب لکھی جو الہیت کے انداز میں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حیات اجتماعیہ میں اخلاق کے معیار کو برقرار رکھنا چاہتا تھا جس کے لئے بجز اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ ایک روحانی رنگ اختیار کیا جائے

اور آسمانی مصادر سے استناد کیا جائے۔

حضرات!

گذشتہ خطبہ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ بلاد مغرب میں علوم جدیدہ کا مرجع سترہویں صدی ہے جس میں کوپرنیکس کے نظریہ اور نظریہ جذب وکشش، اور نظریہ دوران خون، اور کیمیا و طبعیات کے جدید قوانین کا ظہور ہوا۔ اور لوگ سیاروں کے نظام اور تاروں کی کنہ اور ٹوٹنے والے تاروں کی کیفیت سے واقف ہوئے۔ مگر انیسویں صدی تک یہ اکتشافات ان غامض مسائل کونیہ کی تفسیر سے باز رہے جو بائیبل کے عہد جدید اور عہد قدیم میں بیان کئے گئے ہیں، اور اگر انہوں نے اس سلسلہ میں کچھ کیا بھی تو وہ بہت محدود تھا۔ پھر جب ان اکتشافات کی بنا پر مسائل کونیہ کی بحث شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ہی اُن تاریخی روایات کی بحث بھی شروع ہو گئی جو ان کتابوں میں وارد ہوئی ہیں، مثلاً طوفان نوح اور سفر تکوین۔ چنانچہ اس صدی کے اوائل میں لاپلاس (LAPLACE) آیا اور اس نے ظاہر کیا کہ سفر تکوین میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ ہمیں وجود خالق کے نظریہ سے انکار کی طرف لے جاتا ہے پھر علم طبقات الارض کی تحقیقات نے ترقی کی اور اس نے ایسے مفروضات پیش کئے جو سفر تکوین اور قصہ طوفان سے متناقض تھے۔

۱۸۶۳ء میں پروفیسر لائل (LYELL) نے اپنی کتاب قدم الانسان میں بیان کیا کہ انسان اس مدت سے بہت پہلے زمین پر آباد ہو چکا تھا جو تورات نے معین کی ہے۔ مگر اس نے یہ رائے ظاہر کی کہ ان دونوں متناقض بیانات میں اس طرح تطبیق دی جا سکتی ہے کہ شاید تورات میں جو مدت بیان کی گئی ہے اس کے دن بہت زیادہ طویل ہوں اور ہمارے دنوں کی طرح نہ ہوں۔ لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس کی تطبیق ان ایام پر نہیں ہو سکتی جن میں انسان پیدا کیا گیا ہے۔ کیونکہ تورات کے بیانات سے تو یہی مستفاد ہوتا ہے کہ وہ دن ایسے ہی تھے جیسے ہمارے موجودہ زمانے کے دن ہیں۔ بہرحال اس کے عہد کے فلاسفہ میں

عام خیال یہ پھیل گیا تھا کہ علم طبقات الارض نے اناجیل کی بنیادیں ہلا ڈالی ہیں۔ مگر پھر بھی یہ کہنے کے لئے دروازہ کھلا ہوا تھا کہ نوع بشری کا وجود تاریخ سے پہلے کی بات ہے۔ چنانچہ لوگ اسی مذہب پر تھے کہ علم الحیوان نے انسان کی اصل کے متعلق ایک نئی تحقیق پیش کردی اور انسان پر قانون نشو و ارتقا اور تمام نوامیس طبیعی کو منطبق کیا خصوصاً جب سے ڈارون کی کتاب اصل اجناس (ORIGIN OF SPECIES) شائع ہوئی ہے (۱۸۹۵ء) اس کو حقائق ثابتہ میں شمار کیا جانے لگا ہے۔

۱۸۷۱ء میں جب ڈاردن کی کتاب منشار الانسان (THE DESCENT OF MAN) شائع ہوئی تھی اسی وقت سے ایک فکری شورش برپا ہوگئی تھی، اور دینی و غیر دینی طبقوں کے درمیان جدال و نزاع کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ حتیٰ کہ گلیڈ اسٹون کے متعلق مشہور ہے کہ اس زمانہ میں اس نے کہا تھا کہ :-

اگر ہم نظریۂ نشو و ارتقا کو مان لیں تو اس کے اعتبار سے خدا کی یہ حیثیت رہ جائے گی کہ وہ ایک خالق تھا جس کا کام ختم ہوگیا۔ اور اگر قوانین کونیہ کے عدم تغیر کو تسلیم کر لیا جائے اور یہ قرار دے لیا جائے کہ یہ قوانین ایک ہی حالت پر دائماً قائم رہنے والے ہیں تو دنیا میں خدا کی حکومت کی کوئی حاجت باقی نہ رہے گی۔

اگر آپ معلوم کرنا چاہیں کہ گذشتہ صدی کے وسط تک مغرب کے غیر اسلامی ممالک میں حرکۂ عقل اور حریت فکر کا کیا حال رہا ہے تو اس کے لئے میں آپ کے سامنے صرف ایک اقتباس پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک انگریز کارڈینل کے اعلان کا یورپ میں کس طرح استقبال کیا گیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ :-

"۱۸۶۴ء میں کارڈینل مانگ (CARDINAL MANNING) نے اپنے ایک اعلان سے تمام عالم نصرانیت کو حیرت زدہ کر دیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ ہر انسان کو وہی اعتقاد رکھنا چاہیئے جس کو وہ اپنی نفوذ فکر کی بنا پر صحیح سمجھتا ہو اور یہ کہ کنیسہ کو عقاید پر مجبور

کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور یہ کہ امور ماورا طبیعت کا علم ممکن ہے بلکہ اس علم کو تنہا دحی اور کنیسہ کی رغبتوں ہی کا پابند ہونا چاہئے۔ اور یہ کہ کیتھولک فرقہ والوں کو حق ہے کہ دوسری ملتوں سے نکل جانے والے لوگوں کو اپنے مذہب کی دعوت دیں۔ اور انہیں حق ہے کہ اپنی نماز با واز بلند پڑھیں۔ اور یہ کہ یورپ علمی ترقی اور حریت اور مدنیت کے ساتھ تعلقات رہ سکتا ہے "

دیکھئے تو سہی کہ مورخوں نے اس اعلان کو ان بڑے حادثوں میں شمار کیا ہے جنہوں نے عالم نصرانیت کو حیرت زدہ اور مدہوش کر دیا حالانکہ بنظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ کارڈنیل نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا ہے جو عالم اسلامی کو اس وقت سے معلوم ہے جب سے قرآن کا نور دلوں پر آیا ہوا ہے۔ اور اس کی وہ فطری تعلیمات عالم انسانی پر جلوہ فگن ہوئی ہیں۔ جو غور و فکر کو لازم کرتی ہیں کورانہ تقلید کو قبیح ٹھیراتی ہیں، اور عقلوں پر سے پردے اٹھا دیتی ہیں۔

اب تک ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا۔ کہ کئی صدیوں تک فکر بشری اور مغربی ملتوں کے درمیان کیسی سخت نزاع اور پیہم الکھیڑ پچھاڑ رہی ہے تا آنکہ آخر کار عقل کے غالب آجانے اور حریت فکر کے فتح یاب ہو جانے کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ ہم نے "آثار پیدا ہو گئے ہیں" اس لئے کہا کہ اب بھی ہم کو یورپ کے بعض ممالک بلکہ امریکہ کی دنیائے جدید میں ایسے لوگوں کی کمی نظر نہیں آتی جو قدیم تقالید کی حمایت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کے باپ دادا کے اعتقادات تھے ان پر جمے رہنے پر اڑے ہوئے ہیں، اگرچہ وہ تقالید اور اعتقادات مبنی مشہودات سے معارض اور منطقی حجتوں سے متناقض ہی کیوں نہوں کیا آپ بھول گئے کہ گذشتہ سال ہی امریکہ کی ایک جامعہ نے اپنے پروفیسروں میں سے ایک نامور پروفیسر کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ جب اس نے ڈاروِن کے مذہب کی ترویج کی تو اس کے خلاف زبردست شور برپا ہو گیا اور وہ اس وقت تک فرو نہ ہوا جب تک کہ اس پروفیسر کو اس جامعہ کی کرسی

سے الگ نہ کر دیا گیا۔

(خطبہ چہارم)

حضرات!

جہاں تک ممالک غربیہ کا تعلق ہے یہ مختصر بیان ان حالات کی تصویر کھینچنے کے لئے کافی ہے۔ جو گذشتہ کئی صدیوں کے دوران میں عقل بشری کو پیش آئے ہیں، اور ان آلام و مصائب کا اندازہ کرنے کے لئے یہ تھوڑا سا خلاصہ ہی کافی ہے جن کا مقابلہ عقل کو اپنی حریت اور اپنے استقلال کی خاطر ممالک مغربی میں کرنا پڑا ہے آئیے اب ہم ایک اچٹتی ہوئی نظر مشرق پر بھی ڈال کر دیکھیں کہ جس وقت ممالک یونانیہ میں حریت فکر کی پو پھوٹ رہی تھی (یعنی پانچویں صدی قبل مسیح کے اطراف) اس وقت بلاد مشرق میں عقل کا کیا حال تھا۔ جب شرق ادنیٰ میں اکسینوفانیس (XENOPHANES) یونانیوں کے دیوتاؤں پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کر کے اور ان کا مذاق اڑا کر لوگوں کو ان کی عبادت ترک کرنے کے لئے دعوت دے رہا تھا، اور جس زمانہ میں ہرقلیتس اور دیموقریتوس عقول بشری کو تقلید جاہلی کی بندشوں سے نجات دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور ان کو ملکوت ارض و سما پر غور کرنے کی تعلیم دے رہے تھے، ٹھیک اسی زمانہ میں ہمکو مشرق کے دوسرے کنارے پر ایسی عقلی و نفسی حرکت کے آثار نظر آتے ہیں۔ جس کا مقصد سوئی ہوئی ہمتوں کو بیدار کرنا اور جاہل و گمراہ قوموں کو غور و فکر کی راہ دکھانا، اور ان کو اپنی اجتماعی زندگی کے مسائل کی بحث و تحقیق پر آمادہ کرنا تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں بودھ اپنی تعلیمات کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ اور چین میں کنفیوشس اس تفاوت طبقات اور اس سیاسی و اجتماعی نوضویت کے خلاف جنگ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس میں اس کے زمانے کی چینی قوم اور ملک چین کے ارباب حکومت مبتلا تھے، اور اس تنگ دلی، اور درشت خوئی، جور و ظلم اور استبداد کی اصلاح کرتا نظر آتا ہے جو اس کے عہد میں امراء کی امتیازی صفات تھیں۔

یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اگرچہ مشرق کے یہ دونوں علاقے اپنے زمانہ نہضت میں متحد اور اس

نہضت کی کہنہ طبیعت میں متشابہ ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ ہندوستان میں اس کی توجہ، عام مادی احوال کے بجائے زیادہ تر نفس کو اخلاق فاسدہ کی نجاستوں سے پاک کرنے کی طرف مائل رہی ہے، اور چین میں کنفیوشسی نہضت کا مقصد اولین یہ رہا ہے کہ حیات سیاسی واجتماعی اور مظاہر مادی کو منضبط کرنے کے لئے دستور مقرر کئے جائیں اور ان کو ایک نظم کے تحت لایا جائے۔

بزرگو! جس طرح شرق ادنیٰ اور بلاد غربیہ میں مذہبی پیشوائی کے مدعیوں نے ان بدعات ومظالم اور ان ناروا بندشوں اور عبادات کے ان غلط طریقوں کو رواج دیا جنہوں نے خدا کے بندوں کو تکلیف میں ڈالا اور ارواح بشری کو ہلاکت کے گڑھے میں پھینکا، اور عقول انسانی کو غلامی کی قید میں جکڑا، اسی طرح چین اور ہندوستان اور دوسرے ہمسایہ ممالک میں بھی ان کے ہم پیشہ لوگوں نے یہی سب حرکات کیں، اور ان کی بدولت قرون وسطیٰ دنیا کی تاریخ میں بدترین قرون بن گئیں۔ آخر کار علیم حکیم کی حکمت اور رفیق رحیم کی رحمت اس کی مقتضی ہوئی کہ اپنے ظلمت وضلالت میں بھٹکنے والے اور جہالت کی وادیوں میں حیران وسرگردان پھرنے والے بندوں پر نور معرفت کا اشراق فرمائے تاکہ ان کی عقلوں کے بند کھل جائیں، اور ان کے نفوس کی منزلت بلند ہو جائے اس نے انہیں محض ناکام تجربوں کی رہنمائی پر نہ چھوڑ دیا بلکہ ان کو رہائی دلانے اور راہ راست دکھانے کے لئے وحی نازل فرمائی تاکہ وہ ان مجادلات اور مصادمات سے بچ جائیں جس میں دوسری ملتوں اور مذاہب کے لاکھوں طالبان حریت وعدل ومساوات فنا ہو چکے تھے۔ اس کی حکمت نے یہ چاہا اور اسی لئے اس نے قرآن کو دین فطرت کے ساتھ بھیجا تاکہ قید وبند میں جکڑے ہوئے نفوس کو اس کے پاک احکام کے ذریعے سے آزاد کرائے، اور گمراہ عقلوں کو جہالت کے مہلکوں سے نجات دلائے۔

اب میں جو کچھ عرض کرنے والا ہوں اس سے آپ حضرات کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ قرآن کریم نے کس طرح حریت کی راہ میں فکر بشری کی ہدایت فرمائی ہے اور وہ عقل کو کن بلند منزلوں تک اٹھاتے

گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مناسب ہوگا کہ ہم اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر اس سوال کو بھی حل کر دیں جو بعض لوگوں کے دلوں میں کھٹکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب قرآن کا دین دراصل دین فطرت ہی ہے، اور جب احکام کی صحت کا مقیاس، قرآن کے نزدیک عقل اور منطق ہی ہے تو پھر دین کے بذریعہ وحی نازل فرمانے کا کیا فائدہ ہے؟ کیوں عقل بشری کو حق اور حقائق کی راہ میں مجاہدہ کرنے کے لئے تنہا نہ چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ خود ان تک پہنچے اور خیر و شر اور نافع و ضار کی بحث و تنقیب کر کے خود ان کی کنہ کو سمجھے اور ان کے حدود کا ادراک کرے اور ان کے درمیان جو مابہ الفرق و امتیاز امور ہیں ان کو پہچانے؟

ایسے لوگوں سے ہم کہیں گے کہ بلا شبہ انسانی عقل کے لئے یہ ممکن ہے کہ بحث و تنقیب اور تجربوں کے ذریعہ سے احکام اور تصورات اور نظم اجتماعی اور مسائل علمی اور آداب خلقی کے ان مراتب کمال تک پہنچ سکے جن کے لئے نفس انسانی ایک فطری شوق رکھتا ہے۔ لیکن اس راہ میں دو سخت گھاٹیاں ہیں جن کو عبور کئے بغیر اس آرزو کا تحقق نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے ایک عادی ہے اور دوسری طبعی۔

پہلی گھاٹی یہ ہے کہ نفس بشری اپنی حقیقی مصلحت کی خاطر جن وجوہ صواب کی جستجو کرتا ہے ان تک پہنچنے کے لئے صدیوں کے تجارب اور تحقیقات درکار ہیں۔

دوسری گھاٹی ناموس نشو و ارتقا یعنی تدریجی ترقی کی گھاٹی ہے جس کی وجہ سے عالم معقولات و معنویات میں عقل بشری کسی آگے کے مرحلہ پر اس وقت تک نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ وہ اس سے پہلے کے مراحل کو قطع نہ کر لے۔

اس کے علاوہ کچھ اور عوامل بھی ہیں جو تحقیق و بحث کی راہ میں عقل کی پیشقدمی کو روکتے ہیں، اور اکثر ایسی رکاوٹیں ڈالتے رہتے ہیں جن سے بچ کر بہت ہی کم عقلیں نکل سکتی ہیں ورنہ اکثر و بیشتر تو ٹھوکر کھا کر گر ہی پڑتی ہیں۔ ان عوامل میں سب سے زیادہ اہم عامل وہ نفسی انفعالات اور عصبی اضطرابات ہیں جن کے آثار ہماری اجتماعی اور عقلی اور ادبی زندگی کے شعبوں میں اتنے نمایاں ہیں کہ کوئی شخص ان سے ناواقف

نہیں ہے۔ یہ بڑا ہی سخت مغالطہ ہوگا۔ اگر ہم اپنے افکار اور احکام اور میلانات میں کمال کو پہنچنے اور نقائص سے بری ہونے کا ادعا کریں۔ دراں حالیکہ ہمارے اندر ایک نفس امارہ اور ہمارے پہلو میں ایک متلون قلب موجود ہے اور ہم اکثر معاملات میں اپنی خواہشات کی اطاعت اور ہوا و ہوس کی پیروی کیا کرتے ہیں۔

ان وجوہ سے اور اس لئے کہ لوگوں کو سب سے قریب کے اور سب سے زیادہ سیدھے اور سب سے زیادہ محفوظ راستے پر چلایا جائے، خالق کائنات اپنی مخلوقات میں سے پاکیزہ ترین مخلوق کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجتا ہے، کیونکہ اپنے بندوں پر اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لغزش قدم، اور پریشان خوابی، اور خواہشات کے فتنے سے ان کو بچائے اور ان کے سینکڑوں ہزاروں برس اس علم اس حریت و مساوات، اس عدل اور ان تمام فضائل و سلات کی تلاش و جستجو میں ضائع نہ ہونے دے جن کے لئے ان کے نفوس فطرۃً آرزو مند ہیں۔

قرآن حکیم ہر چیز میں دین فطرت لے کر آیا ہے۔ اس کے قواعد احکام اور اصول آداب و شرائع پوری طرح فطرت بشری کے مقتضیات سے مطابقت رکھتے ہیں، حتیٰ کہ اس کی لائی ہوئی شریعت کے امہات اصول میں ایک یہ بھی ہے کہ جو امور مؤثرات کی تاثیر سے متاثر ہوتے ہیں، اور جن میں اختلاف حالات کے ساتھ پے در پے تغیرات واقع ہوتے ہیں ان میں ہر قوم کے عرف کا لحاظ کیا جائیگا۔ اس وجہ سے زمان و مکان کے اختلافات اور مختلف اقوام کے مخصوص عرف کے لحاظ سے شریعت کے فرعی و جزئی مسائل میں اختلاف ہوتا رہتا ہے اس طرح قرآن مجید مطالبِ عقل کے عین مطابق ہے اور انسانی فطرت سے ناآشنا نہیں ہے اور حیات اجتماعی کے شعبوں میں سے کسی شعبہ میں طبیعت بشری کے سلطان و آثار سے تجاہل نہیں برتتا۔

پھر قرآن اس سے خوب واقف ہے کہ انسان اپنے احساس و شعور کی ابتدائی حالت ہی سے ان واقعات و حالات کی علتیں معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے جن کا ادراک اسے اپنے حواس کے واسطہ سے ہوتا ہے۔ اور یہ تلاش و جستجو اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔ اس لئے وہ اس کی اس فطرت کو اور

زیادہ ابھارتا اور اسے بحث و تحقیق کے نئے گوشے دکھاتا ہے۔ اور بار بار ان جامد اور بے حس لوگوں کو
تنبیہ کرتا رہتا ہے جو تقلید کے تنگ دائروں میں اس قدر مقید ہو گئے ہیں۔ کہ ان سے نکل کر وسعت نظر کے
ساتھ کائنات اور اس کی خلقت پر نگاہ نہیں ڈال سکتے۔ اس باب میں قرآن مجید نے تدبر و تفکر کی دعوت
دینے کا موقع ہاتھ سے نہیں دیا ہے۔ اور کوئی حجت اور کوئی برہان ایسی نہیں چھوڑی ہے جو اس نے
حریفان حق پر قائم نہ کی ہو۔

اور جب قرآن نے رسولوں اور نبیوں پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اور اس کے ساتھ ان احکام
و شرائع اور آداب و فضائل کو قبول کرنے کا حکم دیا ہے۔ جو انبیاء نے پہنچائے ہیں، تو یہ ہرگز عقل کے خلاف
نہیں ہے۔ اس لئے کہ عقل جس طرح فطرۃً اس چیز کی حاجت کا شعور رکھتی ہے کہ وقتاً فوقتاً افراد اور جماعتوں
کے ظلم و تعدی کو افراد اور جماعتوں ہی کے ذریعہ سے رفع کیا جاتا ہے (وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ
بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔ ۲: ۲۵۱) اسی طرح اس کی فطرت ہی اُسے اس طرف رہنمائی کرتی ہے کہ وہ ہر
چیز قبول یا وضع کرے جس میں اس کو نظام حیات اجتماعیہ کی بہتری نظر آئے۔ اور چونکہ انسانی عقل، تشریعی
ادبی اور علمی شعبوں کے معالجہ میں نارسائی، لغزش اور قلت وسائل کے خطرات سے دوچار ہے۔ (جس
کی تفصیل ایک دوسرے موقع پر بیان ہو چکی ہے) اس لئے وہ طبعاً اس طرف مائل ہے کہ کسی پر بھروسہ اور اعتماد
کر کے اطمینان و سکون حاصل کرے۔ اور کسی ایسی بات کو قبول کرے جس کے بعد اس کو بحث و تنقیب کی مشقت
نہ اٹھانی پڑے، اور کسی ایسے ماہر کامل کو اپنا رہنما بنالے جو اس کو ظنون اور تجربات کی راہ میں پیش آنے والے
خطرات و مہالک سے بچائے جائے۔ پھر اس اعتماد و قبول کے لئے اس ہستی کی نازل کی ہوئی وحی سے زیادہ
مستحق اور کیا چیز ہو گی جو انسان کی فطرت و طبیعت کے تمام اسرار پر محیط اور ان سب امور کا عالم ہے۔ جن
میں اس کی صلاح شان و سعادت مضمر ہے؟ مزید برآں انسان فطرۃً اپنے معلومات تک پہنچنے کے لئے
سب سے قریب کا راستہ چاہتا ہے۔ اور یہی خواہش اس کو کسی ایسے رہنما کی تلاش پر آمادہ کرتی ہے جس پر وہ اعتماد

کرسکے، اور جس کی ہدایات پر وہ اطمینان و سکون نفس کے ساتھ چل سکے۔ پس نہ صرف عوام بلکہ خواص بھی جس کثرت سے کے ساتھ بعض افراد انسانی پر اعتقاد رکھنے کی طرف مائل ہوتے ہیں اور انبیاء و رسل اور ان کے پیرو داعیوں پر ایمان لاتے ہیں، اس کا اصلی راز یہی ہے کہ وہ ان کی رہنمائی سے بہ آسانی منازل کمال تک پہنچنے اور ان کی ہدایت سے سعادت و سلامتی کی زندگی بسر کرنے کی امید رکھتے ہیں۔ انسان طبعاً اس ایمان و اعتقاد کی طرف مائل ہے، اس لئے کہ وہ فضائل کی معرفت میں درجہ بدرجہ ترقی کرنے سے گھبراتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اس قسم کی تدریجی طلب کرنے والا بسا اوقات صواب کی منزل تک نہیں پہنچتا، اور اس امر کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ سلامتی کے ساتھ اس راہ سے گذر جائے گا۔ وہ متفرق اعمال اور تصرفات اور احکام کے برے عواقب میں پڑنے سے فطرۃً بچنا چاہتا ہے، اس لئے اس کی فطرت ہی اس کو ان نجات کی خوشخبری دینے والے اور ان عذاب سے ڈرانے والے داعیوں کی دعوت قبول کرنے کی طرف مائل کرتی ہے، اور اسے امید دلاتی ہے کہ اس کا مطلوب گم کردہ جس کو اگر وہ خود اپنی کوشش سے طلب کرے تو شاید نہ پا سکے، غالباً اس طریقہ سے مل جائے گا جس کی طرف وہ لوگ دعوت دے رہے ہیں۔

پس انسان کی فطرت سلیمہ اور اس کی آزاد عقل ہی اسے ایک ایسے ہادی اور رہنما پر اعتقاد رکھنے اور مطمئن ہو جانے کے لئے آمادہ کرتی ہے جو اسے خطا، اور لغزش اور گمراہی سے بچا کر سلامتی کی راہ پر چلانے والا ہو۔ اور اسے خوف دلاتی ہے کہ اگر اس نے خود اپنے دلائل اور خود اپنی قوتوں پر اعتماد کیا تو اغلب ہے کہ کہیں ناواقفیت، اور فکر کی غلطی اور قدم سعی کی لغزش کی بدولت وہ ان بہت سے اعلیٰ مطالب اور پاکیزہ رغائب تک نہ پہنچ سکے گا۔ جن تک پہنچنے کی خواہش اس کے نفس میں پنہاں ہے۔ اسی فطرت کے تقاضا سے قائم کئے جاتے ہیں، تہذیب نفس و تہذیب عمل پھیلانے والی جمعیتیں بنائی جاتی ہیں، اور مذہبی پیشواؤں اور صوفیوں کی طرف ہر زمانے میں ہر طبقے اور ہر عمر کے لوگ رجوع کرتے ہیں۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ عقل کو حرکت میں لانے اور فکر کو آزاد کرنے کا کوئی وسیلہ ایسا نہیں ہے

جس کو قرآن مجید نے اختیار نہ کیا ہو وہ جب کسی پر فیصلہ چھوڑتا ہے تو وہ عقل ہی ہوتی ہے۔ اور جب کوئی حجت قائم کرتا ہے تو حکم عقلی ہی کی بنا پر کرتا ہے اور جب کسی پر اظہار غضب کرتا ہے تو عقل کو معطل کردینے والے ہی پر کرتا ہے۔ اور جب کسی سے اظہار خوشنودی کرتا ہے تو وہ ارباب عقل و خرد ہی ہوتے ہیں۔ قرآن نے جہاں کہیں دوسری ملتوں اور مذاہب کے پیروؤں اور بادیین و دہریین سے مجادلہ کیا ہے، وہاں وہ برہان سے ان پر ضرب لگاتا ہے۔ اور بحث و نظر ہی کی طرف انہیں دعوت دیتا ہے، وہ کہتا ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۷: ۱۷۹)

وہ دل رکھتے ہیں مگر ان سے سوچتے نہیں۔ وہ آنکھیں رکھتے ہیں۔ مگر ان سے دیکھتے نہیں۔ وہ کان رکھتے ہیں مگر ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ وہی دراصل غافل ہیں۔

ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں قرآن نے ان گمراہیوں کو اس بنا پر زجر و توبیخ کی ہے کہ انہوں نے اپنی عقلوں کو بیکار کردیا ہے۔ یا باپ دادا کی تقلید میں اتنا مقید کردیا ہے کہ اگر آبائی طریقوں سے بہتر کوئی طریقہ پیش کیا جائے تو وہ اس کو محض اس بنا پر رد کردیں کہ ان کے باپ دادا کے طریقے کے خلاف ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ۔ (۲: ۱۷۰)

اور جب کبھی ان سے کہا گیا کہ جو کچھ اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کی پیروی اختیار کرو تو انہوں نے کہدیا کہ نہیں ہم تو اس طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ لوگ انہی کی پیروی کریں گے۔ اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ نہ سمجھتے ہوں اور نہ راہ راست پر رہے ہوں۔

اور جن آیات میں اپنی عقلوں سے کام نہ لینے والوں اور اندھے مقلدوں کی مخالفت کی گئی ہے

ان میں سے بعض یہ ہیں :۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ، إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (۱۷ : ۴)

اور جس بات کا تجھ کو علم نہیں اس کے پیچھے نہ ہو لیا کر یقین رکھ کہ کان آنکھ اور دل سب سے قیامت کے دن پوچھ گچھ ہو گی۔

اور :۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (۸ : ۳)

اللہ کے نزدیک بدترین حیوانات وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

اور :۔

وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْظُرُ إِلَيْكَ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ (۱۰ : ۵)

اور ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو تیری طرف نظر لگا کے بیٹھے ہیں تو کیا تو اندھوں کو راستہ دکھائے گا چاہے ان کو کچھ نہ سجھائی دیتا ہو۔

پھر تم دیکھو گے کہ جہاں کہیں حریفان حق سے محادلہ کیا گیا ہے وہاں ہر آیت کے ختم پر اس طرح کے نعرے استعمال کئے گئے ہیں ۔ (بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ) (بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو علم نہیں رکھتے)۔ (قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ) (وہ بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہیں)۔ (هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ) (اپنی برہان پیش کرو اگر تم سچے ہو)۔ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ۔ (وہ کدھر بھٹکے چلے جا رہے ہیں) لَوْ تَشْعُرُونَ (کاش تم شعور رکھتے)۔ أَفَلَا يَسْمَعُونَ (کیا وہ سنتے ہی نہیں) إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ (سبق صرف اہل عقل و خرد ہی حاصل کرتے ہیں)۔

قرآن کریم نے جہاں کہیں اپنے پیش کردہ دین کے اقتضا کے مطابق کوئی بات پیش کی ہے وہاں اس کو خوب اچھی طرح سمجھایا ہے ۔ اور جب ارکان دین میں سے کسی رکن اور عقائد میں سے

کسی عقیدہ کی طرف دعوت دی ہے تو اس میں ایسی باتوں سے پرہیز کیا ہے جن کا انسانی عقل احاطہ نہیں کر سکتی اور جن کے ادراک سے بشری فہم عاجز ہے۔ اور جب اصول دین میں سے کسی اصل کی تلقین کی ہے تو مقدمات نظری سے ابتدا کی ہے اور پھر کفر و عناد کی بنا پر اس سے انکار کرنے کے انجام سے ڈرایا ہے مثلاً ایک جگہ کہا ہے :۔

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيَا مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸: ۵) تاکہ جو ہلاک ہو وہ حجت قائم ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ حجت تمام ہونے کے بعد زندہ رہے

اور ایک دوسری جگہ فرمایا :۔

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ (۴: ۲۳) تاکہ لوگوں کے لئے خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے

قرآن کا نازل فرمانے والا جلیل الحکمت خدا، جو انسان کا خالق اور دلوں اور کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے، اپنی آیات میں اپنے آپ کو کمال مطلق کی مثال ہونے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، جس کا اظہار اس کے اسمار حسنیٰ سے ہوتا ہے، مثلاً عدل اور حق اور خیر وغیرہ۔ اس بنا پر اس نے اپنے رسولوں کو جبار اور کوتوال بنا کر نہیں بھیجا بلکہ خوشخبری دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُسَيْطِرٍ (۸۸) اے پیغمبر تو لوگوں کو سمجھا کیونکہ تو فقط سمجھانے والا ہے تو ان پر داروغہ نہیں ہے۔

فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ۔ (۱۶: ۵) تو کیا پیغمبروں پر اس سے زیادہ بھی کوئی ذمہ داری ہے کہ صاف صاف احکام الٰہی پہنچا دیں۔

أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱۰: ۱۰) کیا تو لوگوں کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ مومن بن جائیں؟

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ إِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَ اور ہم تو پیغمبروں کو صرف اس لئے بھیجتے ہیں کہ نیکوں

مُنذِرِینَ وَیُجَادِلُ الَّذِینَ کَفَرُوا بِالبَاطِلِ لِیُدحِضُوا بِہِ الحَقَّ (۱۸: ۸) کو نجات کا مژدہ سنائیں اور بد دل کو عذاب سے ڈرائیں وہ باطل کے بل پر جھگڑا کرتے ہیں تاکہ اس سے حق کو متزلزل کر دیں۔

وَمَا اَنتَ عَلَیھِم بِجَبَّارٍ فَذَکِّر بِالقُرآنِ مَن یَّخَافُ وَعِیدِ (۵۰: ۳) اور تو ان پر حاکم جابر نہیں ہے۔ تو تو بس ہر اس شخص کو قرآن کے ذریعے سمجھا دے جو میرے عذاب سے ڈرتا ہے۔

پہلی چیز جس کے لئے قرآن نے عقل کو حکم بنایا ہے وہ خدا کے وجود پر ایمان ہے نہ صرف قرآن بلکہ اس کے سو علما رکلام واصول دین بھی سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ اس عقیدہ کی طلب طریق نظر واستدلال سے ہونی چاہئے حتیٰ کہ ان میں سے بعض نے تو اللہ پر تقلیدی ایمان لانے کو قبول ہی نہیں کیا ہے۔ اور اگر امام غزالی وغیرہ نے ایمان تقلیدی کو قبول بھی کیا ہے تو وہ عوام کے لئے ایک رعایت ہے کہ وہ بحث ونظر کی استطاعت نہیں رکھتے، اور اس کے وسائل سے ناواقف ہیں یا ان کے قوائے ادراکیہ اتنے قوی نہیں ہیں کہ بحث ونظر کی شرائط پوری کر سکیں۔ اس بنا پر ان سے ایمان ثابت قبول کر لیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کی کوئی سورت آپ کو ایسی نہیں ملے گی جس میں اس نے انسان کو بحث ونظر اور تعقل وتفکر کی دعوت نہ دی ہو۔ اس جگہ ان سب آیات کا استیعاب ممکن نہیں ہے۔ صرف چند آیات پیش کی جاتی ہیں:۔

وَھُوَ الَّذِی مَدَّ الاَرضَ وَجَعَلَ فِیھَا رَوَاسِیَ وَاَنھٰرًا وَمِن کُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیھَا زَوجَینِ اثنَینِ یُغشِی الَّیلَ النَّھَارَ اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَومٍ یَّتَفَکَّرُونَ وَفِی الاَرضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور ہر طرح کے پھلوں کی دو دو قسمیں پیدا کیں اور وہی رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے۔ یقیناً اس میں غور کرنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں اور زمین میں ایک دوسرے سے متصل قطعے ہوتے ہیں۔

مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِى الْاُكُلِ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۱۳: ۱)

جن میں انگور کے باغ اور کھیتی اور کھجور کے درخت دو شاخے اور اکہرے، سب ہی کچھ ہوتے ہیں حالانکہ سب کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے پھر بھی ہم بعض کو بعض پر پھلوں پر برتری دیتے ہیں۔ یقیناً ارباب عقل کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِىْ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۲: ۲)

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات دن کے اختلاف اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے سمندر میں چلتی ہیں، اور اس پانی میں جسے اللہ آسمان سے نازل کرتا اور اس کے ذریعے سے زمین کو جو مردہ ہو چکی تھی، پھر سے زندہ کر دیتا ہے اور پھر اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیتا ہے، اور ہواؤں کی گردش، اور زمین و آسمان کے درمیان گھرے ہوئے بادلوں میں، ارباب عقل کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ... وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ (۸۸)

کیا لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنایا گیا ہے اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بلند کیا گیا۔ اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے نصب کئے گئے ہیں، اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی ہے۔

وَفِىْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱: ۱)

اور خود تمہارے اندر کیسی نشانیاں ہیں کیا تم دیکھتے نہیں ہو

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ

ہم ان کو تمام اطراف عالم میں اور خود ان کے اپنے اندر اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ ان پر ظاہر ہو جائے

الحق (۴۱ : ۶) کہ یہ قرآن برحق ہے۔

اَوَ لَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ (۷ : ۲۴) کیا انہوں نے آسمان و زمین کے انتظام اور خدا کی پیدا کی ہوئی کسی چیز پر بھی نظر نہیں کی۔

معزز حاضرین! یہاں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس باب میں جتنی آیات قرآن کریم میں آئی ہیں ان سب کا استقصاء کیا جائے۔ اس لئے ہم صرف انہی اقتباسات پر اکتفا کرکے ایک دوسرے مسئلہ کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ جس میں اکثر بحث کرنے والوں نے چکر کھائے ہیں۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ ایسے شخص کے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ جس نے بحث و نظر میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور اس کے باوجود وہ دین میں عقیدۂ حق تک نہ پہنچ سکا اس مسئلہ میں علماء نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ اظہار رائے کیا ہے۔ مگر میں یہاں ان کی بحثوں سے تعرض کروں گا اور خود قرآن مجید سے استفسار کروں گا کہ ایسے شخص کے متعلق وہ کیا کہتا ہے

قبل اس کے کہ اس بارے میں قرآن مجید سے استفسار کیا جائے، میں چاہتا ہوں کہ آپ چند مسلمات ذہن نشین کرلیں:۔

ایک یہ کہ جب کسی حکم پر دلیل صحیح قائم ہو جائے تو عقل بشری اس میں شک کرنے پر قادر نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ عقل بشری میں یہ قدرت نہیں ہے کہ دو متناقض امور کے معاً صحیح ہونے کو جائز رکھے۔

تیسرے یہ کہ جب دو حکم متعارض ہوں اور ان میں سے ایک حکم کی تائید میں قاطع حجتیں موجود ہوں تو عقل کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس حکم کو چھوڑ کر دوسرے حکم کو قبول کرے۔

دین فطرت نے ان تینوں قضایا کو ملاحظہ کیا ہے اور اس کی آسمانی کتاب نے ان کی تصدیق کی ہے پھر اس کے بعد علماء نے اس کی تائید کی ہے اور باوجود فرعی مسائل میں مختلف ہونے کے ان سب نے اس قاعدۂ کلیہ کو تسلیم کیا ہے کہ شرعیات میں سے جو چیز بھی بظاہر خلاف عقل معلوم ہو سو اس کی تاویل

اس طرح کی جائے کہ وہ حکم عقلی کے مطابق ہو جائے۔ کیا یہ مسلمات عقلیہ کے حدود پر ٹھہرا اور فطرت انسانیہ کے حکم پر نزول نہیں ہے؟ اور کیا اس قاعدہ کے باوجود عقائد میں جبر اور زبردستی ہو سکتی ہے؟ اور کیا دین فطرت جو دین بحث و نظر ہے ان لوگوں کو کسی عقیدہ پر مجبور کر سکتا ہے جن کی عقلیں اس عقیدہ کے ادراک سے قاصر ہوں، یا جن پر شکوک و شبہات کا اتنا ہجوم ہو کہ وہ ان کو دور کرنے اور انہیں رد کرنے سے عاجز رہ گئے ہوں؟ اور کیا وہ دین جبر اور زبردستی کا قائل ہو سکتا ہے جس نے غیر معقولات پر ایمان لانے کی سخت مخالفت کی ہے، اور جس نے ایسے ایمان کے مقابلے میں اُس یقینی عقیدۂ ایمان کی بنیادیں قائم کی ہیں جو طریق عقل و نظر سے حاصل ہوتا ہے؟

اللہ تعالیٰ کا عدل اس سے بالاتر ہے کہ وہ لوگوں کو اس چیز کی تکلیف دے جس کی ان میں طاقت نہ ہو، یا ایسی چیزوں پر ایمان لانا ان پر لازم کرے جن کی طرف حجت اور برھان ان کی ہدایت نہ کرتی ہو۔ یہ بات اللہ تعالےٰ کے اس قول پر غور کرنے سے اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ۔

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (۴: ۲۳) — تا کہ پیغمبروں کے آجانے کے بعد لوگوں کے لئے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔

اب ہم قرآن کریم کی ان آیات میں سے بعض کو پیش کرتے ہیں جو اس مقام سے مناسبت رکھتی ہیں:-

قَالَ يٰقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتَانِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُوْنَ (۱۱: ۲۸) — نوح نے کہا کہ اے میری قوم، کیا تم نے غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے کھلے رستے پر ہوں اور اس نے اپنی طرف سے مجھکو رحمت عطا فرمائی ہے، پھر وہ رستہ تم کو دکھائی نہیں دیتا، تو کیا ہم تمہیں زبردستی اس پر چلائیں گے درانحالیکہ تم اس کو ناپسند کرتے ہو؟

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (۵۰: ۳)

ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ تم ان پر کوئی حاکم جابر تو ہو نہیں۔ جو کوئی میری وعید سے ڈرے اس کو بس تم قرآن کے ذریعہ سے سمجھا دو۔

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ (۲: ۱۴)

ہم نے ان لوگوں کے لئے اپنی آیات واضح کر دی ہیں جو یقین کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ہم نے تم کو دینِ حق دیکے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور تم سے دوزخیوں کی بازپرس نہ ہوگی۔

اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (۴۲: ۵)

تم پر خدا کا پیغام پہنچا دینے کے سوا اور کچھ ذمہ داری نہیں ہے۔

اِنَّمَا اَنْتَ نَذِيْرٌ (۱۱: ۲)

تم تو بس عذابِ خدا سے ڈرا دینے والے ہو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن جو دینِ فطرت کی کتاب ہے ہرگز ایسی کوئی بات پیش نہیں کرتا جو درست اور صحیح آرا کے منافی ہو یا جس کی حکمت عقولِ سلیمہ سے پوشیدہ ہو۔ اور وہ ہرگز انسان کی عقل کو ایسی باتوں پر ایمان لانے کی تکلیف نہیں دیتا جو غیر معقول ہوں۔ اور وہ ہرگز انسان کے جسم کو اس بار کے برداشت کرنے پر مجبور نہیں کرتا جس کو اٹھانے کی اس میں طاقت نہ ہو۔ اور وہ ہرگز انسان پر ایسا کوئی فرض عائد نہیں کرتا جو اس کی فطرت کی وسعت میں نہ سماتا ہو۔ اس کا اصلی کام تو یہی ہے کہ وہ نوعِ بشری کو ہدایت کا قریب ترین راستہ دکھلائے۔ اور خدا کے بندوں کو ہلاکت کے ان گڑھوں سے بچا کر نکال لے جائے جو طریقِ وحی کے بجائے طریقِ تجربہ سے حق اور حقیقت کی تلاش کرنے والوں کی راہ میں پیش آتے ہیں اور ان شیاطین الانس ان ظالم حکام، ان گمراہ کرنے والے مذہبی پیشواؤں سے محفوظ رکھے جو حق کے راستہ میں رہزنی کرنے کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس باب میں جتنے شواہد و دلائل آپ چاہیں وہ آپ کو مل سکتے ہیں دیکھیے کہ طلاق اور تحریم شراب اور تحریم قمار کے معاملہ میں مغربی

قوموں کی عزیمت کیسے تلخ تجربوں اور کتنی مدتوں کے بعد درست ہوئی ہے[۵۱]؟ اور کیسے شدید مقابلوں اور کتنی طویل صدیوں کے بعد ان میں عقل کو آزادی نصیب ہوئی اور حریت فکر اور حریت اظہار رائے کو مباح تسلیم کیا گیا، اور انسان کے ابتدائی فطری حقوق تسلیم کئے گئے[۵۲]؟ دینی اور سیاسی شورشوں کی تاریخ سے پوچھو، وہ تمہیں بتلائے گی کہ کتنے خون اس سلسلہ میں بہائے گئے اور کتنی جانیں اس راہ میں ہلاک کی گئیں؟ اس سے دریافت کرو، وہ تمہیں ان ہنگاموں کے مصائب و آلام کی ہولناک داستان سنائے گی اور ان کلفتوں کا حال بیان کرے گی جن سے قوموں کو دوچار ہونا پڑا ہے۔

اس کے بعد مجھ کو مسئلہ ارتداد سے بحث کرنی ہے جو بہت بسط و تفصیل چاہتی ہے۔ اس لئے تنگی وقت کی بنا پر اس کو دوسرے اجتماع کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں دو اہم مسائل پر اور بھی کلام کروں گا۔

۱۔ دین فطرت کی کتاب ہونے کے اعتبار سے معجزات اور خوارق کے باب میں قرآن کریم کا موقف۔

۲۔ ناموس نشو و ارتقاء اور اس کے قوانین کی تنقیح ان دلائل کے مقابلہ میں جو قرآن نے قائم کئے ہیں اور وجود خالق پر استدلال کرتے ہوئے جن میں نظر کرنے کی طرف اس نے دعوت دی ہے۔

پھر میں تکلیف عینی اور حریت ضمیر انفرادی کے متعلق قرآن کا مسلک مختصر طور پر بیان کر کے ختم کروں گا۔

---

۵۱ بلکہ حقیقتہً اب بھی درست نہیں ہوئی۔ مترجم۔

۵۲ یہ خواب بھی ابھی تک محروم تعبیر ہے خطیب مرحوم کی وفات کے بعد یورپ میں جو انقلابات پیش آئے ہیں وہ پھر اس پچھلے دور استبداد و قہر کی جانب رجعت کا اظہار کر رہے ہیں۔ مترجم۔

بازار ساحری

کرشمۂ کن و بازار ساحری بشکن

(از جناب مولانا عبداللہ العمادی)

(۱)

ہرچند قرآن پاک نے پیشینگوئیوں سے بہت کم بحث کی ہے اور واقعات کی تاریخ بیان کرنے میں تو حصہ لیا ہی نہیں تاہم جہاں کہیں دیکھا کہ عوام میں کوئی ایسی بات مشہور ہے کہ اصل ایمان پر اس سے بُرا اثر پڑنے کا احتمال ہے وہاں فوراً واقعہ کی اصلیت بیان کرکے مناسب الفاظ میں شبہات کی تکذیب کر دی۔ گو اس زمانے کے ہوا پرستوں کو اس کے ماننے میں تامل ہوا لیکن بعد کی دریافتوں نے ثابت کر دیا کہ ھٰذا القرآن یقص علی بنی اسرائیل اکثر الذی ھم فیہ یختلفون و انہ لھدی و رحمۃ للمومنین۔

یہودیوں میں مشہور تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام شیطانوں کی پیروی کرکے کافر ہوگئے تھے ہاروت و ماروت دو فرشتے ہیں جن پر خدا نے جادو اتارا ہے اور وہ لوگوں کو جادو کرکے ہلاک کر ڈالتے ہیں۔[۱]

اس افواہ سے اول تو حضرت سلیمان کی رسالت میں شک پڑتا تھا اور دوسرے بڑا شبہ یہ ہوتا تھا کہ جادو جب ایسی بُری چیز ہے کہ اس کے اثر سے لوگ تباہ ہو جاتے ہیں تو خدا نے اس کو فرشتوں پر کیوں اتارا؟ تباہ و ہلاک کرنے کی قدرت تو صرف خدا میں ہے پھر دو اور شخص اس میں کیوں شریک ہوگئے؟

کلام اللہ نے اس شبہ کو دو لفظوں میں صاف کر دیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے کفر نہیں کیا بلکہ

---

[۱] تفسیر کبیر جلد ا صفحہ ۱۵۱۔

شیاطین کفر کرتے تھے۔ اور ہاروت و ماروت پر جادو خدا کی طرف سے اترا نہیں تھا اور نہ وہ اس کے ذریعہ سے کسی کو ضرر پہنچا سکتے ہیں اور نہ اس سے انہیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے ۔"

ظاہر ہے کہ اس بیان کے بعد شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن ہوا پرستوں کو اس وقت تک یقین نہ آیا جب تک موسیو مورگن کو آثار بابل میں وہ کتابے نہ ملے جن میں ہاروت و ماروت اور ان کی معشوقہ زہرہ کی سیاہ کاریوں کی پوری داستان درج ہے۔ ان کتابوں سے جو پختہ اینٹ کی سلوں پر ہیں۔ قرآن مجید کے بیان کی حرف بحرف تصدیق ہوتی ہے اور اس سے پایا جاتا ہے کہ یہ دونوں بظاہر تو ایسے فرشتہ عفت تھے کہ لوگ ان کو بادشاہ فرشتہ اور دیوتا سمجھتے تھے لیکن در اصل پھنسانے کے لئے انہیں بڑے بڑے ہتھکنڈے یاد تھے۔

کلام اللہ نے آج سے بہت پہلے اس غلط فہمی کو رفع کیا ہے اور مفسرین نے اس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ امام رازی کہتے ہیں:۔

قرء الحسن "الملکین" بکسر اللام وھو مروی ایضاً عن ابن عباس ثم اختلفوا فقال الحسن کانا علجین اقلفین ببابل یعلمان الناس السحر وقیل کان رجلین صالحین من الملوک[۱]	حسن بصریؒ نے "ملکین" کے لام کو زیر سے پڑھا ہے اور یہی ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے۔ اختلاف پھر اس کے بعد ہے چنانچہ حسنؒ کا قول ہے کہ ہاروت و ماروت بیدین و ناختنہ بریدہ تھے اور بابل میں لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ ایک روایت ہے کہ دونوں صالح بادشاہوں سے تھے۔

ان بزرگوں نے جن میں حضرت ابن عباسؓ اور حسنؒ بصری ایسے صحابی و تابعی شامل ہیں تصریح کر دی کہ ہاروت و ماروت فرشتے نہیں تھے آدمی تھے اور یہی مشہور مفسر ضحاک کا بھی قول ہے

---

[۱] تفسیر کبیر جلد ۱ صفحہ ۱۵۱

فتح البیان میں ہے۔

قال الضحاك هما (ای هاروت و ماروت) علجان من اهل بابل ۔ ۱؎	ضحاک کا قول ہے کہ ہاروت و ماروت بابل کے دو بیدین آدمی تھے۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ ہاروت و ماروت کا قصہ یہودیوں سے ماخوذ ہے اور ایک روایت یہ ہے کہ یہ دونوں فرشتہ نہ تھے بلکہ فرشتہ صفت ہونے کی وجہ سے ان کا یہی لقب پڑ گیا تھا۔ فرماتے ہیں۔

وما روی انهما مثلا بشرین ورکب فیهما الشهوة ...... فحکی عن الیهود ... وقیل رجلان سمیا ملکین باعتبار صلاحهما ویؤیده قراءة الملکین بالکسر وقیل ما انزل نفی معطوف علی ماکفر و تکذیب للیهود فی هذه القصة ۲؎	یہ جو روایت ہے کہ ہاروت و ماروت فرشتے سے آدمی بنائے گئے اور ان میں شہوت دی گئی ...... تو یہ یہودیوں سے مروی ہے ...... ایک روایت میں ہے کہ یہ دونوں آدمی تھے اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے لوگ انہیں فرشتہ کہتے تھے اور "ملکین" بالکسر کی قراءت اسی کی تائید کرتی ہے۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ "ما انزل" نفی ہے اور "ماکفر" پر عطف ہے اور اس قصہ میں یہودیوں کی تکذیب ۲؎ ہے۔

صاحب تفسیر مظہری یہ لکھ کر کہ "ما انزل علی الملکین" میں "ما" نفی کے لئے ہے یعنی سحر خدا کی جانب سے نہیں اترا تھا۔ قصہ ہاروت و ماروت کے متعلق فرماتے ہیں:-

وهذه القصة من اخبار الاحاد بل من الروایات الضعیفة الشاذة ولا دلالة علیها فی القرآن بشیٔ .... وان	یہ قصہ خبر احاد ۳؎ بلکہ ضعیف و شاذ روایت سے منقول ہے اور قرآن میں اس پر کوئی دلیل نہیں ...... اسی قسم کی کوئی حدیث بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نہ تو

۱؎ فتح البیان جلد ۱ صفحہ ۱۴۴ ۲؎ بیضاوی شریف صفحہ ۱۰۰

۳؎ خبر احاد وہ حدیث جس کا راوی اول صرف ایک شخص ہو ایسی خبریں یقین کے لئے مفید نہیں ہوتیں۔

هٰذہ الاخبار لم یرو منہا شیٔ صحیح ولا سقیم عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم [1] صحیح مروی ہے، اور نہ غلط۔

ابن جریر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ "ملکین" سے مراد جبریل ومیکائیل ہیں" اور ہاروت وماروت "شیاطین" سے بدل ہے۔

ان کے خاص الفاظ یہ ہیں۔

اِتَّبِعُوْا مَا تَتْلُوْا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ وَمَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَی الْمَلَکَیْنِ وَلٰکِنَّ الشَّیَاطِیْنَ کَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ بِبَابِلَ ہَارُوْتَ وَمَارُوْتَ۔ فَیَکُوْنَ معنیا بالملکین جِبْرِیْلَ وَمیکائیل لان سحرۃ الیہود فیما ذکر کانت تزعم ان اللہ انزل السحر علی لسان جبرئیل ومیکائیل الی سلیمان بن داؤد فاکذبہم اللہ بذٰلک واخبر نبیّہ صلی اللہ علیہ وسلم ان جبریل ومیکائیل لم ینزلا بسحر وبرّا سلیمان مِمَّا غلوہ من السحر واخبرھم ان السحر من عمل الشیٰطین وانہا تعلم الناس ذٰلک ببابل وان الذین یعلمونہم ذٰلک رجلان احدھما ہاروت والاٰخر ماروت فیکون ہاروت وماروت علی ہٰذہ التاویل ترجمۃ عن الناس وردًّا علیہم۔

یعنی یہودیوں کا گمان تھا کہ خدا نے جبرآیل ومیکائیل کے ذریعہ سے حضرت سلیمان پر جادو اتارا ہے۔ خدا نے اس کی تکذیب کی کہ ان دونوں فرشتوں پر کچھ نہیں اترا۔ جادو تو شیاطین سکھایا کرتے ہیں۔ اور بابل میں ہاروت وماروت نامی دو خاص آدمی ہیں جن کا یہی نام ہے۔

اس مطلب کو علامہ قرطبی نے بھی پسند کیا ہے اور ان کے نزدیک اس کے سوا کوئی تاویل قابل

---

[1] تفسیر مظہری صفحہ ۸۲۔

التفات نہیں۔ لکھتے ہیں۔ هذا ادلی ما قیل فیها ولا یلتفت الی سواه[1]۔

(۲)

سحر کی تاثیر میں ہم خود کلام کرنا نہیں چاہتے۔ ہاں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ البتہ فرماتے ہیں کہ۔ "انه خدع لا اصل له ولا حقیقة[2]"۔ یعنی سحر ایک قسم کا فریب ہے جس کی کوئی اصلیت و حقیقت نہیں ہے۔

یہ امر کہ "سحر اگر کوئی چیز نہیں تو تخت بلقیس کے اٹھا لانے کا عفریت نے کیونکر دعویٰ کیا" خارج از بحث ہے اس لئے کہ مجاہد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ طرفۃ العین میں تخت کے اٹھا لانے سے بہت جلدی اٹھا لانا مراد ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں:۔

اختلفوا فی قوله قبل ان یرتد الیك طرفك علی وجهین الاول انه اراد المبالغة فے السرعة کما تقول لصاحبك افعل ذلك فی لحظة وهذا قول مجاهد[3]۔

غرض کہ ہاروت ماروت کو بعضوں نے فرشتہ لکھا ہے اور بعضوں نے آدمی۔ لیکن اس آیت کو کسی نے متشابہ نہیں بتایا ہے۔

(۳)

اس ضمن میں ہم یہ بھی دکھانا چاہتے ہیں کہ سحر و جادو سے حقیقی عربی تمدن کو بھی تعلق نہ تھا یہ بنائے فساد عرب میں غیر قوموں کے طفیل سے دخیل ہوئی۔

اہل عرب ان چیزوں کو جو لطیف الماخذ اور دقیق الصنعت ہوتیں "سحر" کہا کرتے تھے۔

---

[1] فتح البیان ج ۱ ص ۱۳۳۔ [2] عینی ج ۲ ص ۵۲۱۔ طبع قسطنطنیہ۔ و فتح البیان ج ۱ ص ۱۳۲۔ طبع مصر

[3] تفسیر کبیر ج ۶ ص ۵۶۲۔

اور جن چیزوں میں چابکدستی اور سحر کی سی گرفت ہوتی کہ چیز اپنی اصلی حقیقت کے خلاف نظر آتی اس کو "شعبدہ" کہتے تھے۔ یہ لفظ معرب ہے جس کے معنی افسون کے ہیں۔ سحر میں اصلی چیز فریب ہے جس شخص پر سحر ہوتا اس کو فریفتہ (فریب دادہ) کہتے۔ شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی علیہ الرحمۃ اپنی تفسیر عزیزی میں آلات صنعت و مکانیکس اور یورپ کی گھڑیوں کو بھی ایک قسم کے سحر میں شمار کرتے ہیں[1]۔

جاہلیت میں عرب کے قرب و جوار میں جو قومیں رہتی تھیں ان کا گمان یہ تھا کہ سحر و شعبدہ کا استفادہ جواہر قسل کے خواص اور حسابی امور میں اور مطالع نجوم کے علم سے ہوتا ہے۔ جس پر سحر کرنا ہوتا اس کی صورت کا ایک ہیکل بناتے اور اس کے لئے ایک مخصوص وقت کے منتظر رہتے جس میں خاص ستارے نکلتے ہیں اور اس کے ساتھ کچھ بیلے ملا کر شیطانوں سے فریادی ہوتے تھے۔ جس شخص پر سحر ہوتا ان کے خیال میں ان سب باتوں کی وجہ سے اُس کی عجیب حالت ہو جاتی اور حقیقت بدل جاتی۔ اس غرض کے لئے جن و شیاطین کو غلام بنانے کے لئے قربانی اور بھینٹ چڑھایا کرتے تھے اور اس فن میں بہت سی کتابیں بھی تصنیف کی تھیں جن میں ابن وحشیہ کلدانی کی کتاب القرآبین زیادہ مشہور ہے جس کو اس نے عربی میں ترجمہ کیا تھا۔

عہد تمدن میں جب غیر قومیں اسلام کے زیر اثر آئیں اور مسلمانوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا اور اکثر لوگ مسلمان بھی ہوئے تو مسالہ سحر کی اصلاح پر بھی توجہ کی اور اب یہ کہنے لگے کہ ہم "لوگ خدا کی عبادت میں مستغرق رہتے ہیں تضرع کیا کرتے ہیں، شیاطین و ارواح کو اس کے نام کی قسم دیتے ہیں، اور نفسانی خواہشوں کو ترک

---

[1] شاہ عبد العزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ کی اصل عبارت یہ ہے: "قسم ہفتم سحر حیل است با ستعانت آلات عجیبۃ الصنعت امور غریبہ حادث کنندہ اتخاذ آن آلات بیشتر بر تعمق در ریاضات مبنی می باشد مثل حیل بنی موسیٰ و آلات ساعت شناسی کہ فرنگیان می سازند۔" (فتح العزیز، مطبوعہ ۱۲۶۴ھ صفحہ ۲۵۸)۔

عربی میں "حیل" آلات کو کہتے ہیں اور بنی موسیٰ سے مراد موسیٰ بن شاکر کے تینوں بیٹے محمد، احمد و حسن ہیں جو بہت سے عجیب و غریب آلات کے موجد گزرے ہیں۔

کر کے عبادت کا التزام رکھتے ہیں لہٰذا جن و شیاطین و ارواح ہماری اطاعت و خدمت کرتے ہیں۔ ہمارے امر و نہی کے مطابق تصرف کیا کرتے ہیں اور خدا کے نام سے قسم دینے کی وجہ سے مطیع رہتے ہیں اس لئے کہ اسمار الٰہی کی خاصیت یہ ہے کہ ان کو مطیع کر سکتے ہیں"

قدیم زمانہ کفر و جہالت میں جادو گروں نے بہت سی کتابیں سحر میں لکھی تھیں۔ مثلاً کتاب آریوس بن اصطفان بن بطلینس رومی جو رومی افسونگروں میں سب سے بڑا عالم اور سربرآوردہ قوم کے لقب سے ملقب تھا۔ اُس نے اپنی کتاب میں جنوں اور دیوؤں کے حسب نسب اور ابلیس کی اولاد اور ملکوں میں ان کے متفرق ہونے کا تذکرہ کیا ہے اور ان میں ہر جنس سے جو علل و ارواح و استہلاکات و افعال مخصوص ہیں سب کو بیان کیا ہے۔ ایک دوسری کتاب لوہق ساحر کی ہے جس میں جنوں کی سرشت و موالیدؔ مواخیذ اور سرکش ارواح کا بیان ہے یہ کتاب آریوس رومی کی کتاب سے بڑی ہے۔

محمد بن اسحاق صاحب مغازی و سیر کا بیان ہے کہ خلفائے بنی عباس کے زمانہ میں اور خصوصاً بعہد خلیفہ مقتدر باللہ عباسی افسانوں اور خرافات سے بڑی دلچسپی لی جاتی تھی۔ اس وجہ سے افسانہ نویسوں نے خرافات میں کتابیں تصنیف کیں اور جس قدر جی میں آیا اُن میں جھوٹ لکھا۔ اس قسم کے خرافات بہت سے لوگ بنایا کرتے تھے جن کو علامہ ابن الندیم بغدادی نے مع نام و لقب بیان کیا ہے علمی کتابوں کے ضمن میں جب سحر کی کتابیں بھی عربی میں ترجمہ ہوئیں تو عوام پوری طرح سے ادھر ملتفت ہوئے۔ اس لئے کہ وہم یہ سمایا ہوا تھا کہ سحر کے ذریعے سے ہر قسم کے عجیب غریب کام مثلاً ابھارنا۔ توجہ دینا۔ تسلط بٹھانا۔ فوجوں کو شکست دینا۔ دشمنوں کو قتل کر ڈالنا۔ پانی پر چلنا اور دور و دراز مسافتوں کو تھوڑی دیر میں قطع کرنا ممکن ہے یہی وجہ ہے کہ سحر میں اکثر کتابیں تالیف ہوئیں۔

اس کا بادی ابن ہلال تھا۔ پیشتر اہل عرب ان امور سے ذرا بھی واقف نہ تھے۔ یہ دروازہ اسی نے کھولا۔ وہ اس فن میں سرآمد تھا اور اس نے اکثر کتابیں لکھی تھیں۔ مثلاً:

۱۔ ارواح پراگندہ۔

۲۔ مفاخر اعمال۔

۳۔ تفسیر اقوال شیاطین بحضرت سلیمان علیہ السلام۔

۴۔ عہد سلیمانؑ باشیاطین[1] اس کے بعد ابن ہلال کے بہت سے مقلد نکل آئے جنہوں نے اپنی تصانیف میں اس کی پیروی کی۔ مثلاً ابن امام۔ صالح حدیری۔ عقبہ آذرمی۔ ابوخالد خراسانی۔ ابن ابی رصاصہ۔ خلف بن یوسف۔ حماد بن مرہ۔ وغیرہ وغیرہ جن کے نام گنانے سے کچھ حاصل نہیں۔

مسلمانوں میں شعبدہ کا بھی رواج نہ تھا۔ پہلے پہل عبید الکیس (فرزانہ) اور ایک اور شخص تے جو قطب الرحا کے نام سے مشہور تھا اس بازی گری میں نام پیدا کیا۔ اس فن میں ان دونوں کی کئی کتابیں ہیں۔ مثلاً عبید فرزانہ کی کتاب شعبدہ و کتاب الخرافات اور قطب الرحا کی کتاب جس میں چابکدستی اور ریزہ ریزہ کر ڈالنے اور بیخ کنی کا بیان ہے اور ایک اور کتاب جس میں تلوار اور لکڑی اور پتھر اور چونہ نگل لینے اور صابون و شیشہ چبانے اور کھانے کا تذکرہ ہے اور ان سب کی تدبیریں اور طریقے لکھے ہیں[2]

غرض کہ اسلام کو ان نکمے خرافات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ آلائش جس سے اس کا دامن آلودہ ہوا یونانی اور رومی تمدن کا بقیہ تھی اور اس پر علماء اسلام نے سخت اعتراضات کئے اور سحر و شعبدہ میں مشغول ہونے والوں کی بڑی توبیخ کی۔

---

[1] کتاب الفہرست صـ ۳۱۲ طبع لیپزک۔

[2] کتاب الفہرست صـ ۳۱۲

کرشمۂ قدرت

(از مولانا عبداللہ العمادی)

کائنات کی ہر چیز اپنی قدرت و اقتدار کی نمائش چاہتی ہے مگر مُبدع کائنات کی قدرت کاملہ کی نموداریوں کو دیکھتی ہی نہیں، اور اگر غلط انداز نظروں سے دیکھ بھی لیا تو آمادۂ تکذیب ہو گئے۔ آج کی صحبت میں اسی قدرت کاملہ کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے جس کو سمجھنے اور جس سے عبرت حاصل کرنے کے لئے پہلے آپ سورۂ رحمان کی تلاوت کر لیجئے اور پھر اُس رحمان ورحیم کی قدرت دیکھئے۔

(۱)

سورۂ رحمان میں جا بجا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ کا تنبیہی فقرہ وارد ہوا ہے جس کے معنی "اے جماعت جن وانسان تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مُکرتے رہو گے" بتلائے جاتے ہیں۔ اس فقرہ کا نسق اس طرح واقع ہوا ہے کہ پہلے خدا کی نعمتیں مذکور ہیں۔ پھر ان پر تنبیہ کیا گیا ہے۔ مثلاً۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانِ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ۔	اور (اسی خدا نے) خلقت کے (فائدہ کے) لئے زمین بنا دی ہے کہ اس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جن (کی گیلوں) پر (قدرتی) غلاف چڑھے ہوتے ہیں اور (طرح طرح) کے اناج جو (بھوسی کے خول

میں ہوتے ہیں اور خوشبودار پھول ہیں۔ تو (اے جماعت جن وانسان) تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں سے مکرتے رہو گے؟

لیکن مشکل یہ ہے کہ اس فقرہ کے قبل جا بجا ایسی ترتیب وتہدید کی آیتیں بھی وارد ہیں جن سے نعمت ورحمت کا مفہوم بمشکل سمجھ میں آسکتا ہے۔ مثلاً :-

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَا الثَّقَلٰنِ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ۔ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ (آیت ۱۵-۲۲)

اے دونو گروہو عنقریب ہم تمہاری طرف کلیتہً متوجہ ہونے والے ہیں۔ تو اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں سے تم دونوں مکرتے رہوگے۔ اے گروہ جن وانس اگر تم سے ہو سکے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے رہ کر کہیں کو نکل بھاگو تو نکل دیکھو مگر کچھ ایسا ہی زور ہو تو نکلو (اور وہ تم میں نہ ہے اور نہ ہو) تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔ تم پر آگ کی کچی پکی لو برسائی جائیگی کہ تم اس کو دفع نہ کرسکوگے۔ تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں سے مکرتے رہوگے پھر جب (قیامت کے دن) آسمان پھٹا اور تیل کی طرح (اس کی رنگت) لال ہوئی (وہ آخری فیصلہ کا دن ہوگا) تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے تو اس دن نہ تو گنہگار کے گناہ کی بابت کسی آدمی سے پوچھا جائے گا اور نہ کسی جن؎ سے تو اے دونو گروہو تم خدا کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے! اس دن گنہگاروں کو ان کی صورت سے پہچان لیا جائے گا۔ پھر ان کے)

؎ یہ ترجمہ ہم نے سب سے الگ ہوکر اس لئے کیا ہے کہ امام رازی نے اس آیت کی ترکیب میں ایک مشکل پیدا کرکے اس کے دو جواب دیئے ہیں۔ پہلا جواب ان کی رائے میں معمولی ہے اور دوسرے جواب کی نسبت لکھتے ہیں " وثانیھما وھوالادق وبالقبول (باقی برصفحہ ۵۸)

پٹھے اور پاؤں پکڑے جائیں گے۔ تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے، یہ ہے وہ جہنم جس کو گنہگار لوگ جھٹلاتے ہیں (اور قیامت کے دن) اس میں اور کھولتے ہوئے پانی میں (بیقرار پڑے) پھریں گے۔ تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔

اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے کوشش ہونے لگی کہ جس طرح ہو سکے وعید آخرت و عذاب جہنم وغیرہا سے بھی نعمت کی شان پیدا کی جائے اور ثابت کیا جائے کہ لوگ جس چیز کو عذاب سمجھ رہے ہیں اس میں بھی نعمت و رحمت کی ادائیں ہیں۔ اس بنا پر تاویلات ذیل غور طلب ہیں۔

(الف) جن وانس کی جانب عذاب و ثواب پہنچانے کے لئے خدا کا متوجہ ہونا خود ہی نعمت ہے۔ اس سے بڑی اور نعمت کیا ہوگی کہ مطیع کو ثواب اور منکر کو عذاب دیا جائے گا۔ [۵۱]

(ب) آسمان و زمین کے دائرہ سے باہر نکل جانے کی دھمکی بھی نعمت ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا نے جن وانس کے درمیان اس بات میں برابری کی نعمت عطا فرمائی ہے کہ اس کے ارادات و احکام کے خلاف نہ جن کوئی کام کر سکتے ہیں اور نہ انسان [۵۲]

(ج) آگ کی کچی پکی لو برسائی جانے اور آسمان پھٹنے اور لال ہونے میں کوئی تاویل نہ چل سکی اور نعمت کا مفہوم ان چیزوں میں کسی طرح نہ نکل سکا۔ اس لئے علامہ ابن جریر نے اس آیت میں نعمت کی تاویل نظر انداز کردی [۵۳]۔ مگر دوسرے مفسرین یہی کہتے چلے جاتے ہیں اور نعمت کا مطلب نکالنے کے باب میں خاموش

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۷) احق ان یجعل ما یعود الیہ الضمیر قبل الفعل میقال تقدیرہ " فالمذنب یومئذ لایسأل عن ذنبہ انس ولا جان " ملاحظہ ہو جلد ۸۔ صفحہ ۲۵۔

[۵۱] ابن جریر جلد ۲۷۔ آخر صفحہ ۱۱۱

[۵۲] ابن جریر جلد ۲۷ آخر صفحہ ۷۲ و اول صفحہ ۷۱

[۵۳] ابن جریر۔ صفحہ ۷۴

ہو جاتے ہیں۔

(د) گنہگار کے گناہ کی بابت کسی دوسرے سے سوال نہ ہونا اس لئے نعمت ہے کہ صرف گنہگار پر عذاب ہوگا اور بے گناہ بری رہیں گے۔[1]

(ھ) گنہگاروں کی پہچان قائم رہنا اور ان کی پکڑ دھکڑ ہونا بھی نعمت ہے کہ انہیں کی ذلت واہانت ہوئی اور دوسرے بچ گئے[2]

(و) گنہگاروں کا جہنم سپرد کرنا اور انہیں کھولتے پانی میں ڈالنا بھی نعمت ہے اس لئے کہ وہ اس کے مستحق تھے۔[3]

(ز) نعمتیں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔

ایک نعمت ضروریات زندگی کا پیدا کرنا ہے مثلاً زمین جس پر ہم رہتے ہیں۔ اس کا پیدا کرنا بھی نعمت ہے یہ نہ ہوتی تو جگہ رہنے کے لئے کہاں سے آتی۔

نعمت کی دوسری قسم میں وہ چیزیں داخل ہیں جن کو بلا واسطہ ضروریات زندگی میں داخل کرنا تو مشکل ہے۔ مگر ہماری ضرورتوں میں کار برآری کے لئے اُن کا ہونا بھی لازمی ہے۔ مثلاً نظام شمسی کی حرکت اور سیاروں کی چال کہ بغیر ان کے نہ موسم بدل سکتے ہیں، اور نہ غلہ پیدا ہو سکتا ہے۔

تیسری قسم کی نعمت وہ ہے کہ گو محتاج الیہ نہ سہی مگر مفید ضرور ہے مثلاً دریاؤں کا پیدا کرنا اور کشتیاں چلانا۔

چوتھی قسم کی وہ نعمت ہے کہ چاہے مفید نہ ہو۔ مگر ان سے ایک طرح کی آرائش ہو جایا کرتی ہے جیسے لعل و گوہر

یہ چاروں نعمتیں تو قوائے جسمانی کے متعلق ہوئیں۔ پانچویں نعمت جو سب سے بڑی ہے یہ ہے کہ خدا نے یہ جسمانی نعمتیں بھی انسان کو عنایت کیں اور ان سب سے اعلیٰ ایک روحانی نعمت بھی عطا فرمائی یعنی علم و

---

[1] ابن جریر صفحہ ۵، [2] ابن جریر صفحہ ۵، [3] ابن جریر صفحہ ۶۔

تعلیم[1] (الرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ)

یہ ہیں وہ تاویلیں جن کی بنا پر فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ میں لفظ "اٰلَآءِ" کو نعمتوں کا مرادف ثابت کیا گیا ہے۔ لیکن کیا اس حد تک پہنچ کر تحقیق کا خاتمہ ہو گیا اور آگے کے لئے کوئی بات باقی نہیں رہی۔ اس کی تنقیح کے لئے ایک ذرا تامل کرنا چاہیے۔

(۲)

ان تاویلات کے متعلق ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے اس لئے کہ منکروں پر عذاب ہونا ممکن ہے کہ مطیع بندوں کے لئے رحمت و نعمت ہو کہ بارے اس بلا و مصیبت میں وہی مبتلا ہوئے جو اس کے مستحق تھے، غیر مستحق بچ تو رہے لیکن سوال یہ ہے کہ عذاب جہنم کی وعید تو صرف منکروں سے مخصوص ہے مطیع و مومن کو اس سے کیا تعلق۔ آگ کی کچی پکی تو انہیں جن و انس پر برسائی جائے گی جنہیں خدا کی خدائی سے انکار تھا اور دنیا میں وہ اُس کی عظمت و جبروت کو جھٹلایا کرتے تھے۔ آیات میں انہیں منکروں سے خطاب بھی ہے اور انہیں کو ڈرایا بھی گیا ہے ظاہر ہے کہ ان کا گرفتار بلا ہونا دوسروں کے لئے نعمت ہو تو ہو خود ان کے لئے کسی طرح بھی نعمت نہیں۔ اور دوسروں کا جب یہاں تعلق ہی نہیں تو یہ بیل منڈھے چڑھے تو کیونکر؟ خطاب منکرین و مکذبین سے، مستحق عذاب ہوں منکرین و مکذبین، عذاب ہیں خود ان کے لئے کسی قسم کی نعمت و رحمت کا شائبہ نہو۔ با ایں ہمہ صرف پرائی نعمت کو یاد دلا دلا کے اُن پر مار پڑے۔ وہی مثل ہوئی کہ ہمسایہ کو خلعت ملا اور مار مجھ پر پڑی کہ تو اس نعمت کی قدر نہیں کرتا اور احسان نہیں مانتا۔ رہی نعمتوں کی فیلسوفانہ تقسیم، تو اس میں ہزار نکتے نکالے جائیں مگر یہ باتیں اسی وقت مفید ہو سکتی ہیں جب پہلے یہ ثابت ہو لے کہ منکروں کا آگ میں جلایا جانا خود ان منکروں کے لئے نعمت نہیں ہے رحمت ہے۔ یہ کیا کہ رحمت کا تعلق مومنین سے ہو اور اس کا احسان کفار پر جتایا جائے یہ تو لسان الغیب کی داد خواہی ہوئی کہ؎

خدارا داد من بستاں از وائے شحنۂ مجلس — کہ مے با دیگراں خوردست و با من سرگراں دارد

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۵۔

(۳)

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا ہر آیہ اور ہر سورہ اپنے ماقبل و مابعد سے مربوط و منتظم ہے۔ سورۂ رحمٰن سے پہلے سورۂ قمر ہے جس میں چاند جیسے عظیم الشان کرّہ کے پھٹنے، منفذائے آسمان کے پٹ کھولنے اور بڑی بڑی جبّار اقوام کے پامال و فنا کر دینے کے اشارے ہیں اور ان سب کے تذکرہ سے خدا نے بندوں پر اپنی عظمت وجلال وقدرت کا سکہ بٹھایا ہے۔ سورہ رحمٰن کے بعد سورہ واقعہ ہے جس میں قیامت ہونے، زمین کے دہل اٹھنے پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو جانے بہشتیوں اور دوزخیوں پر رحمت اور عذاب ہونے سڑی گلی ہڈیوں پر گوشت و پوست پہنا کر آدمی بنانے مخلوقات کی شکل و ہستی بدل دینے۔ ومثل ذٰلک کے تذکرے ہیں بعد ان کی بھی یہی غرض ہے کہ کمزور، بر خود غلط انسان کو جناب باری کی عظمت واقتدار کا اندازہ ہو سکے۔ ان دونوں کے بیچ میں سورۂ رحمٰن ہے جس کا افتتاح اس پر ہے :-

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ	اس بڑے رحم والے (معبود) نے قرآن کی تعلیم دی۔ انسان کو پیدا کیا۔
الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ اَلشَّمْسُ	اسے بولنا سکھایا۔ سورج اور چاند ایک حساب کے
وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَّالنَّجْمُ[1] وَالشَّجَرُ	ساتھ (گردش میں) ہیں۔ اور بوٹے اور درخت سر

[1] "نجم" ستارہ کو بھی کہتے ہیں اور بوٹیوں کی جھاڑی کو بھی لیکن ستارے کی نسبت درخت کے ساتھ گل بوٹے کو زیادہ مناسب ہے اور ابن جریر نے حضرت ابن عباس و سعید و سُدّی و سفیان سے یہی روایت بھی کی ہے کہ اس آیت میں شجر سے تناور درخت مراد ہے اور نجم سے بوٹوں کی جھاڑی۔ خود ابن جریر بھی اختلاف کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں۔ واولی القولین قول من قال عنی بالنجم ما نجم من الارض من نبت لعطف الشجر علیہ فکان بان یکون معناہ لذلك ما قام علی ساق وما لا یقوم علی ساق یسجد ان للہ بمعنی انہ تسجد لہ الاشیاء کلھا المختلفۃ الھیأت من خلقہ یعنی نجم کے معنی میں ستارہ اور بوٹوں کی جھاڑی کے دو قول جو ہیں تو ان دونوں میں یہ قول زیادہ صحیح و صائب ہے کہ نجم سے مراد وہ نباتی جھاڑیاں ہیں جو زمین سے اگتی ہیں اس لئے کہ لفظ "شجر" اسی پر معطوف ہے۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ درخت جو ساق دار ہوتا ہے اور جھاڑی جو بے ساق کی ہوتی ہے دونوں خدا کے آگے سربسجود ہیں۔ یعنی اس کے مخلوقات میں تمام چیزیں جن کی شکل و ہیأت خواہ کتنی ہی مختلف ہو، سب اس کی فرمانبرداری کے لئے حاضر ہیں (تفسیر ابن جریر۔ ج ۲۷۔ ص ۶۲)

یَسْجُدٰنِ ؎ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ — سجود ہیں۔ اور اُسی نے آسمان کو اونچا کیا اور ترازو بنا دی ہے کہ تم لوگ
الْمِیْزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ — تولنے میں (حد اعتدال سے) تجاوز نہ کرو۔ اور انصاف کے ساتھ
وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا — سیدھی تول تولو اور کم نہ تولو۔ اور اسی نے خلقت کے (فائدے
الْمِیْزَانَ ۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا — کے) لئے زمین بنا دی ہے کہ اس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت
لِلْاَنَامِ فِیْهَا فَاکِهَةٌ وَّالنَّخْلُ — ہیں جن کے (کیلوں) پر (قدرتی) غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ اور خوشبودار
ذَاتُ الْاَکْمَامِ ۔ وَالْحَبُّ — پھول ہیں۔ تو (اے جن و انسان کے دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار
ذُوالْعَصْفِ وَالرَّیْحَانُ فَبِاَیِّ — کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہو گے۔ اسی نے انسان (اول)
اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۔ خَلَقَ — کو ٹھیکری کی طرح بجنے والی مٹی سے پیدا کیا اور جنوں کو آگ کی لو
الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ — سے۔ تو (اے دونو گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں
وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ — سے مکرتے رہو گے، (وہی جاڑے اور گرمی میں) آفتاب کے نکلنے کے
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۔ رَبُّ — دو (مختلف مقاموں) اور (ایسے ہی) ڈوبنے کے دو (مختلف) مقاموں
الْمَشْرِقَیْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَیْنِ ۔ فَبِاَیِّ — کا مالک ہے۔ تو (اے دونو گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی
اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۔ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ — نعمتوں سے مکرتے رہو گے" اسی نے دو (طرح کے) دریا نکالے کہ

؎ سجدہ سر جھکانے کو کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ نہ درخت سر جھکاتے اور نہ جھاڑیاں سجدہ کرتیں۔ لیکن علامہ ابن جریر طبری نے ابو رزین و سعید سے روایت کی ہے ظلهما سجودهما۔ یعنی درختوں اور جھاڑیوں کا سجدہ یہی ہے کہ ان کا سایا پڑتا پھرتا ہے۔ (ابن جریر صفحہ ۶۲) اصل میں سجدہ کے مفہوم میں غایت انکسار و تذلل و فرمان برداری مضمر ہے۔ اس لئے آیت میں سجدہ سے سر جھکانے کی ہیئات مراد نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم مقصود ہے۔ علامہ ابو السعود صفحہ ۱۷۱ میں لکھتے ہیں)۔

"یسجدان ای ینقادان لله تعالیٰ فیما یرید بهما طبعًا انقیاد الساجدین من المکلفین طوعًا"

جلد ۸) (درخت اور جھاڑیاں سجدہ کرتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا جس بات کو چاہتا ہے وہ قدرتی طور پر اس امر میں حکم الٰہی کی مطیع رہتی ہیں اور یہ اطاعت ان کی اسی رنگ کی ہے جس رنگ میں کہ خدا کے مکلف بندے اظہار اطاعت کے لئے سجدہ کرتے ہیں)۔

يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ فَبِاَيِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَان۔ يَخْرُجُ مِنْهُمَا
اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَان فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبَانِ۔ وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَاٰتُ
فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبَانِ۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقٰى
وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۱۳-۱)

آپس میں ملتے ہیں (اور پھر بھی) دونوں میں ایک پردہ
(رہتا) ہے کہ (اُس سے ایک دوسرے کی طرف) بڑھ
نہیں سکتے[۱]۔ تو (اے دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار
کی کون کونسی نعمتوں سے مکرتے رہوگے (نکلتے ہیں[۲]
اُن دونوں میں سے بڑے اور چھوٹے موتی[۳] تو (اے
دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں
سے مکرتے رہوگے۔ اور اسی کے ہیں جہاز جو دریا میں
پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے (دکھائی دیتے) ہیں
تو (اے دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔ اس کرۂ زمین پر جتنے
متنفس ہیں سب فنا ہونے والے ہیں اور (صرف) تیرے پروردگار کی ذات باقی رہ جائے گی جو بڑی عظمت والی اور بزرگ
(ذات) ہے۔ تو (اے دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔

---

[۱] دو دریا نکالنے کے متعلق عجیب عجیب اختلافات پیدا ہوگئے ہیں مشکل پسند طبیعتوں کے نزدیک معمولی دریاؤں میں کوئی
خاص اہمیت نہ تھی کہ قرآن میں ان کا تذکرہ ہوتا اس لئے بات یہ پیدا کی کہ دو دریاؤں سے ایک وہ دریا مراد ہے جو آسمان
میں ہے اور ایک وہ جو زمین ہے۔ یہ دونوں سال میں ایک مرتبہ ملجایا کرتے ہیں۔

دوسرے فریق نے غالباً یہ سمجھ کر کہ بحر فارس و بحر روم سے مسلمانوں کے تعلقات نہایت وسیع ہیں تعین کر دی کہ "مرج
البحرین" میں خدا نے انہیں دونوں دریاؤں کا ارادہ کیا ہے۔

ابن جریر نے صفحہ ۶۸ میں یہ دونوں روایتیں نقل کی ہیں۔ اور خود ان کی رائے میں پہلی روایت کو ترجیح ہے۔

لیکن اس مشکل پسندی میں پھنسنے کی ضرورت کیا ہے جس چیز کا تعین خدا اور رسولؐ نے نہ کیا ہو اور عقل و علم بھی اس کے
حامی نہ ہوں اس کو ماننا کیا ضرور ہے۔ کیوں نہ وہ تمام دریا اس سے مراد ہوں جو باہم ملتے ہیں اور پھر بھی جدا رہتے ہیں (باقی بر صفحہ ۶۴)

تاریخ شاہد ہے کہ عجمیت کے غلبہ نے عربیت کے خط و خال تک بدل دیئے اس طوفان میں عربی زبان اور اس کے اسلوب کا برقرار رہ جانا کچھ آسان نہ تھا، الفاظ تو وہی رہے مگر معانی تبدیل ہو گئے لغویین نے اکثر سب عجمی تھے اِلّا ماشاء اللہ وہی بدلے ہوئے معانی لغت میں ثبت کر دیئے کس کو فرصت کہ کلام جاہلیت کا تتبع کرے اور سمجھے کہ کلام اللہ جس زبان میں نازل ہوا اس کے کلمات کا مفہوم اس زبان میں کیا تھا۔

یہی دیکھئے کہ لفظ آلاء کے معنی سب نے نعمتوں کے قرار دیئے ہیں۔ علامہ زمخشری عربی زبان کے ایک مشہور ادیب ہیں اور عربیت میں ان کی دستگاہ مسلّم ہے مگر اپنی تفسیر میں وہ بھی اس سے قدم نہیں بڑھاتے۔

(بقیہ صفحہ ۶۳) کمال اتصال پر بھی ایک دوسرے سے ممتاز رہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر زیادتی کا موقع نہ ملے۔

۵۲ امام رازی نے یہ مانکر کہ آیت مذکورہ میں دو دریاؤں سے میٹھے اور کھارے پانی کے دو دریا مراد ہیں۔ خود ہی یہ اعتراض کیا ہے کہ ان دونوں قسم کے دریاؤں سے موتی کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں۔ موتی تو محض دریائے شور میں پیدا ہوتے ہیں میٹھے پانی کے سمندروں میں تو پیدا نہیں ہوتے اس اعتراض کا امام صاحب نے کئی طرح سے جواب دیا ہے۔

(۱) قرآن جب دعویٰ کر رہا ہے کہ دونوں قسم کے سمندروں سے موتی نکلتے ہیں تو اس کے خلاف انسانی تجربہ ناقابل تسلیم ہے

(۲) بالفرض دریائے شور ہی میں موتی پیدا ہوتے ہوں۔ لیکن آخر پیدا تو صدف کے اندر مینہ کے قطرہ ہی سے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مینہ کو آسمان ہی کے دریا سے تعلق ہے۔

(۳) دونوں دریاؤں سے موتی پیدا ہونے کا یہ منشا نہیں ہے کہ ہوں تو دونوں میں ہوں۔ کسی ایک میں بھی اگر پیدا ہوں تو مطلب نکل آیا۔ محاورہ میں کہتے ہیں۔ خرج فلان من بلاد کذا۔ ودخل بلاد کذا۔ بلاد بلدہ کی جمع ہے۔ حالانکہ اس شخص کا داخلہ یا خروج کسی ایک خاص شہر سے ہوا کرتا ہے (تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۱۴ و ۱۵)

ان تاویلوں کے متعلق دریافت طلب یہ ہے کہ:- (۱) قرآن نے کب اور کہاں یہ دعویٰ کیا کہ مرج البحرین میں "بحرین" سے دریائے شور و دریائے شیریں مراد ہیں اور ان دونوں سے موتی پیدا ہوتے ہیں۔ (۲) صدف میں مینہ کے قطرے سے موتی کا پیدا ہونا خلاف تحقیق ہے۔ (۳) آخری تاویل قرین قیاس ہے بشرطیکہ تاویل کا مبنیٰ ضعیف نہ ہو۔

۵۳ محاورۂ عرب میں بڑے موتیوں کو لؤلؤ اور چھوٹے کو مرجان کہتے ہیں۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباس اور قتادہ و ضحاک کی روایتیں بھی اس کی تائید میں نقل کی ہیں۔ (تفسیر ابن جریر جلد ۲۷ صفحہ ۹۹)

اہل لغت میں صاحب لسان العرب کا خاص پایہ ہے مگر وہ بھی آگے نہیں بڑھتے [۱]
اکیلے ایک ابن جریر طبری ہیں کہ آلاء کے معنی "قدرۃ" لکھتے ہیں۔

لیکن اس معرکۂ جدال میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کلام اللہ جس زبان میں نازل ہوا آیئے اسی زبان اور اسی صدی کی زبان میں دیکھیں کہ اہل زبان اس کے کیا معنی سمجھتے تھے۔

کمیت اپنے گھوڑے کی صفت کرتا ہے۔

فرضیت "الاء" الکمیت فمن یبع   فرسا فلیس جوادنا بمباع [۲]

حماسی اپنے ممدوح ولید بن ادہم کے اقتدار کا مرثیہ خوان ہے۔

اذا ما امرؤٌ اثنیٰ بآلاءِ میّتٍ   فلا یبعد اللہ الولید بن ادھما

نضالہ فقر کی برائیاں گناتا ہے:۔

وفی الفقر ذلٌّ للرقاب، وقلّما   رأیتُ فقیراً غیر نکس مُذ مم

یلامُ وان کان الصواب بکفه   وتُحمد "آلاء" البخیل المدرهم [۳]

لطف یہ ہے کہ خود صاحب لسان العرب نے مادّہ "نبہ" میں طرفہ کا یہ شعر نقل کیا ہے:۔

کاملٌ یجمع "آلاء" الفتی   نَبِهٌ سیدُ سادات خضم [۴]

کلام میں تدبر کرنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں "الاء" کو قدرت و اقتدار کے معنے میں استعمال کرتے تھے جو نعمت و عذاب دونوں پر یکساں حاوی ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اوصاف مراد لیتے تھے یہی معانی کلام عرب سے مترشح ہیں، اور کلام اللہ میں، ٹھیک اترتے ہیں۔

---

[۱] لسان العرب ج ۱۸ ص ۴۶۔ [۲] کتاب الاقتضاب للبید الطوسی ص ۴۵۔ [۳] کتاب المعرین ۸۵
[۴] لسان العرب ج ۱۷ ص ۴۴۔

(۵)

ایک بات کہنے سے رہ گئی، منشاء غلط نابغہ کا یہ شعر تھا:۔

ھم الملوك و ابناء الملوك لھم فضلٌ علی الناس فی "الآلاء والنعم

عجمی اہل لغت "نعم" "اور" آلار" کو قیاس کر کے دونوں کو مترادف سمجھے، اور اس ترادف کو وصت باور

کرنے کے لئے پورا دیوان عجم بھرا پڑا تھا۔

فردوسی کہہ چکا ہے:۔

بہ بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب

سمجھے کہ انگبیں و شہد ایک ہے تو "آلار" اور "نعم" کیوں نہ ایک ہوں، اسلوب عرب سے گر آگاہ

ہوتے تو مترادفات کا خیال ہی نہ آتا جس سے ادب عرب کو سوکار ہی نہ تھا۔ جاہلیت کا کوئی دیوان دیکھئے

ایک بیت میں ایک معنے کے لئے دو لفظ کبھی نہ لائیں گے اگر کسی نے یہ غلطی کی تو ساقط الاعتبار ہو گیا ۔

نابغہ کا مطلب صاف ہے کہ "الآر" یعنے اقتدارات اور نعمات دونوں میں اس کے ممدوحین کی افضلیت

مسلّم ہے۔

حاشیہ۔ آلار جمع ہے اور اَلی واحد واحد کی صورت میں جب مکسور الاوّل لاتے ہیں تو اس سے عہد

و پیمان مراد لیتے ہیں۔ اعشیٰ کہتا ہے۔

ابیض لا یرھبُ الھزال و لا یقطع رحمًا و لا یخون "إلا"

جمع کی صورت میں جب الار کو غیر ممدود لاتے ہیں تو اس سے ایک درخت مراد لیتے ہیں جس کے

پھل دیکھنے میں تو خوش مزہ مگر چکھنے میں بہت تلخ ہوتے ہیں بشر بن ابی خازم کہتا ہے۔

فانکم و مدحکم بُجَیْرًا ابا لجاءٍ کما امتدح "الالاء"

نعمت سے آلار کی تاویل بھی خوش منظر ہے، لیکن اہل ذوق کو اندیشہ ہے آلار کی طرح یہ بھی تلخ نہ ہو

(۶)

مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو کہ سورۂ رحمان کی ابتدا جہاں خدا کی رحمت سے ہوئی ہے کہ سابق و لاحق کی جلال و جبروت کی باتوں سے انسان مرعوب ہو کر از خود رفتہ نہ ہو جائے۔ وہیں ساتھ کے ساتھ ایسے واقعات بھی یاد دلائے ہیں جو قدرت خداوندی کے عظیم الشان نمونے ہیں اور جن و انس کو ان پر متنبہ کیا ہے کہ وہ قادر مطلق جس کی قدرت اس قدر وسیع ہو اُس کے کون کون سے اقتدار سے مکر سکتے ہو۔ علامہ ابن جریر فرماتے ہیں:۔

حدثنی یونس قال اخبرنا ابن وھب قال قال ابن زید فی قوله "فبای آلاء ربکما تکذبان" قال "الالاء القدرة فبای آلائه تکذب خلقکم کذا و کذا فبای قدرة الله تکذبان ایھا الثقلان الجن والانس"

مجھ سے یونس نے روایت کی کہ ابن وہب نے انہیں اطلاع دی کہ "فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ" کے متعلق ابن زید لکھتے ہیں کہ "آلآء" کے معنے قدرت کے ہیں۔ یعنی خدا نے تمہیں اس طرح پیدا کیا۔ تم اے جماعت جن و انس خدا کی کون کون سی قدرتوں کو جھٹلاؤ گے۔ [۱]

امام رازی خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ انسان کو جو نعمتیں خدا نے دی ہیں جب ان کا گننا مقصود تھا تو "جن" کے پیدا کرنے میں کون سی نعمت ٹھہری۔ اس اعتراض کے تین جواب دیئے ہیں۔ اور آخر میں لکھتے ہیں:۔

ان الایة مذکورة لبیان القدرة لا لبیان النعمة [۲]

یہ آیۃ نعمت کا تذکرہ کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ قدرت کا تذکرہ کرنے کے لئے ہے [۲]

ایک دوسرے مقام پر یخرج منهما اللؤلوء والمرجان (ان دو طرح کے دریاؤں

---

[۱] تفسیر ابن جریر جلد ۲۷ صفحہ ۶۵ [۲] تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۱۳

میں سے بڑے چھوٹے موتی نکلتے ہیں) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

ای نعمة عظیمة فی اللؤلؤ المرجان حتی یذکرهما الله تعالی مع نعمة تعلیم القرآن وخلق الانسان؟	بڑے چھوٹے موتی ہیں کون ایسی بڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تعلیم اور انسان کی آفرینش کے ساتھ میں اس کا بھی تذکرہ کیا؟

اس اعتراض کے دو جواب دیئے ہیں۔ ایک وہ جس میں نعمتوں کی تقسیم کی ہے اور جس کو حرف (ز) کے تحت ہم نقل کر چکے ہیں۔ دوسری توجیہ حسب ذیل ہے:۔

هٰذه بیان عجائب الله تعالیٰ لا بیان النعم[1]	یہ اللہ تعالیٰ کے عجائب قدرت کا بیان ہے۔ نعمتوں کا بیان نہیں ہے۔[1]

الاء کو قدرت کا مماثل مان لینے کے بعد کسی تاویل کی حاجت نہیں رہتی۔ رحمت و نعمت و عذاب ان سب کا مفہوم اسی قدرت کے تحت آجاتا ہے؟

---

[1] تفسیر کبیر ص۱۵

غرانیق علےٰ

(از جناب مولانا عبداللہ العمادی)

(۱)

غرانیق، غرنیق یا غرناق یا غرنوق کی جمع ہے۔ جس سے گورے رنگ کے خوبرو نرم و نازک نوجوان مراد ہیں۔

اِذا انتَ غِرْناق الشباب میال ذو دا یتین ینغان السربال

امیر المومنین علیؓ بن ابی طالب فرماتے ہیں۔

کَأَنّی انظر الیٰ غُرْنوقٍ مِنْ قریشٍ یتشحّط فی دمہ

بھری جوانی کا مفہوم بھی آتا ہے:۔

الا ان تطلاب الصبیٰ منک زلّۃٌ وقد فات ریعان الشباب الغرانق

فربہ و جسیم کو بھی کہتے ہیں۔

قلتُ لسعدٍ وھو بالا زارق علیک بالمحض وبالمشارق

واللھو عند بارنٍ غرانق

ایک طرح کی مرغابی کا نام بھی ہے:۔

اجار اینا لجّۃ بعد لجّۃٍ اذل کغرنیق الضحول عمُوجُ

اسی نام کا ایک پودا بھی ہے ۔

ابن الانباری کہتے ہیں:۔

الغرانیق العُلیٰ ھی الاصنام وھی فی غرانیق علےٰ سے بت مراد ہیں، اصل میں یہ مرغابیوں کا

الاصل الذکور من طیر الماء رکانوا یزعمون ان الاصنام تقربھم من اللہ وتشفع لھم الیہ فشبھت بالطیور التی تعلو وترتفع فی السماء۔

نام ہے مشرقین کو گمان تھا کہ جناب الٰہی میں بت ان کے ذریعہ تقرب ہیں اور اس بارگاہ میں ان کی شفاعت کرتے ہیں، اسی بناء پر بتوں کو ان چڑیوں سے تشبیہ دی جو بلند ہوں اور اونچے اڑیں اور آسمان کی خبر لیں۔

—— (۲) ——

یہ تو لفظ کے معنی ہوئے، اب مطلب کو دیکھئے کہ مظہر عجائب و مطلع غرائب ہے۔

اس لفظ کو آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منسوب کرتے ہیں کہ یوں تو آپ ہمیشہ بتوں کے دشمن تھے، لیکن ایک دن شیطان نے قابو پا کر آپ کی زبان سے بھی بتوں کی تعریف کرا ہی لی۔

کیا شیطان کو اتنی قدرت ہے کہ انبیائے کرام بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکیں؟ مفسرین اس سوال کے جواب میں مذبذب ہیں، اور اس تذبذب کی وجہ سورہ حج کی یہ آیت ہے:۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (آیت ۲۲ : ۳۶)

ہم نے تمہارے قبل کوئی رسول و نبی ایسا نہیں بھیجا کہ اس نے جب تمنا کی ہو تو شیطان نے اس میں وسوسہ نہ ڈالا ہو، خدا شیطانی وسوسہ کو مٹا کر اپنی نشانیوں کو استوار کرتا ہے اور خدا دانا حکیم ہے

یعنی پیغمبر جب تقرب الی اللہ کے لئے کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو شیطان اس کے خلاف وسوسے پیدا کرتا ہے، پیغمبر اس صورت میں خدا سے رجوع کرتا ہے۔

اس کی نظیر ایک دوسری آیت ہے۔

ان الذین اتقوا اذا مسھم طائف من الشیطان تذکروا فاذا ھم مبصرون۔
(سورہ ۷، رکوع ۲۴، آیت ۱۷۹)

پرہیزگاروں کو جب شیطان کی کسی گروہ نے چھولیا یعنی برے خیال ان کے دل میں آئے، تو انہوں نے (اللہ کو) یاد کرنا تھا کہ ناگاہ بینش والے ہو گئے

ایک اور آیت میں ہے:۔

واما ینزغنک من الشیطان نزغ شیطان جب تیرے دل میں کوئی وسوسہ ڈالے تو
فاستعذ باللہ ۷ : ۲۴ خدا سے پناہ مانگ

غرض یہ ہے کہ پیغمبران مرسل کو خدا نے اگرچہ دانستہ خطا سے معصوم بنایا ہے لیکن جواز سہو اور وسوسہ شیطانی سے وہ معصوم نہیں۔ اس باب میں جو تمام آدمیوں کا حال ہے وہی ان کا بھی ہے بجز ان امور کے جو وہ جان کر کریں۔ سہو میں ان کی پیروی نہ کرنی چاہیئے۔ یہ کام وہ بالقصد کرتے ہیں استواء محکم وہی ہے

ابو مسلم کہتے ہیں کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے انسان کے لئے انہیں میں سے پیغمبر بنا کر بھیجے ہیں فرشتے نہیں بھیجے ہیں۔ اور کوئی پیغمبر ایسا نہیں کہ وحی کی تلاوت میں شیطانی وسوسہ سے بچا ہو۔ شیطان اس کے ذہن میں وحی کی منافی باتیں ڈال دیتا ہے، اور اسے یاد کرنے نہیں دیتا۔ لہذا اللہ تعالیٰ پیغمبر کو وحی اور حفظ وحی پر ثابت قدم کر دیتا ہے اور اسے یہ بتا دیتا ہے کہ یہ امر درست ہے اور شیطان کی جانب سے جو بات ہوتی ہے اس کو مٹا دیتا ہے (رازی ج ۶ ص ۲۵)

(۲)

مفسرین اس کی شان نزول میں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جب قوم کا رخ بدلے ہوئے رہنا گراں گذرا تو آپ کے جی میں آیا کہ ایسی وحی نہ اترتی جس سے قریش متنفر ہوں۔ اس لئے کہ آپ کو ان کے ایمان لانے کی بڑی تمنا تھی، ایک روز آپ قریش کی ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ سورۂ "والنجم اذا ھویٰ" اترا، آپ نے اس کو پڑھنا شروع کیا۔ جب اس آیت پر پہنچے۔ اَفَرَاَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی۔ وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی۔ اور وہ خواہش دل میں موجود تھی تو شیطان نے آپ کی زبان پر جاری کر دیا کہ۔ تلک الغرانیق العلٰے وان شفاعتھن لترتجیٰ۔ (یعنی ان نازک اندام و عالیشان بتوں سے شفاعت کی امید ہے) قریش نے جب یہ سنا تو خوش ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بدستور پڑھتے رہے حتیٰ کہ جب سورۃ ختم ہوئی تو آپ نے آخر میں سجدہ کیا اساتھ ہی مجلس میں جتنے مسلمان و کافر تھے سب نے سجدہ کیا۔ قریش کی خوشی کا کیا کہنا کہنے لگے کہ محمدؐ نے ہمارے معبودوں کو خوبی سے یاد کیا ہے۔ حضرت جبرئیل ؑ آئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ نے یہ کیا کیا کہ خدا کی جانب سے میں جو الفاظ نہیں لایا تھا وہ آپ نے پڑھ دیئے اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم رنجیدہ ہوئے اور بہت ڈرے تو اللہ نے یہ آیت اتاری۔

اس واقعہ کو ابن ابی حاتم طبری و ابن منذر نے شعبہ کی سند سے اور بزار و ابن مردویہ نے امیہ بن خالد سے روایت کیا ہے اور وہ بھی شعبہ ہی سے روایت کرتے ہیں۔ ابن اسحاق نے اس کو تفصیلاً سیرۃ النبیؐ میں محمد بن کعب کی سند سے اور موسیٰ بن عقبہ نے مغازی میں ابن شہاب کی سند سے اور ابو معشر نے محمد بن کعب کی سند سے روایت کیا ہے۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ "معنی سب کے ایک ہیں اور بجز سعید بن جبیر کے یہ حدیث اور جتنے طریقوں سے روایت ہوئی ہے سب یا تو ضعیف ہیں یا منقطع ہیں۔ لیکن کثرت طرق سے پتہ چلتا ہے کہ قصبہ کی کچھ نہ کچھ اصلیت ہے۔ اس کے دو طریقے اور بھی ہیں جو مرسل ہیں۔ اور ان کے راوی ویسے ہی ہیں جیسے صحیحینؓ کے ایک روایت تو وہ ہے جو طبری نے یونس بن یزید کی سند سے ابن شہاب سے روایت کی ہے اور دوسری وہ ہے جو معتمر بن سلیمان و حماد بن سلمہ کی سند سے روایت کی ہے۔ ابوبکر بن العربی نے حسب عادت بڑی جرأت سے کہا ہے کہ طبری نے اس بارے میں بہت سی لغو بے اصل روایتیں درج کی ہیں" اور عیاض نے کہا ہے کہ اس حدیث کو اہل صحت میں کسی ثقہ نے بسند صحیح متصل روایت ہی نہیں کیا ہے۔ اس کے ناقل جتنے ہیں سب ضعیف ہیں روایتیں مضطرب ہیں اور سند منقطع ہے۔ تابعین و مفسرین میں جن لوگوں نے

لہ حدیث مرسل وہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے یا یہ کہا ہے اور صحابی جس کے واسطے سے اس کی حدیث روایت کرنی چاہیئے اس کا نام نہ لے حدیث مرسل کے قابل استدلال ہونے میں اہل علم مختلف ہیں۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اگر کسی دوسرے درست طریقے سے بھی مرسل کی تقویت ہوتی ہو تو مان لینا چاہیئے ورنہ نہیں۔ +

اس قصہ کو بیان کیا ہے کسی نے سند نہیں پیش کی اور نہ اصل راوی تک مرفوع کیا۔ اس کے اکثر طریقے ضعیف ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ "یہ تمام اقوال خلاف قاعدہ ہیں۔ اس لئے کہ روایت کے طریقے جب کثیر ہوں اور ماخذ مختلف ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کوئی اصلیت ہے اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ان میں تین حدیثوں کی سندیں صحیح کے قاعدے پر ہیں اور یہ تینوں مرسل ہیں۔"[1]

(۴)

حقیقت یہ ہے کہ" ایسی حالت میں حدیث مرسل سے استدلال صحیح نہیں روایت جب فاسد ہے تو گو اس کے بہت سے طریقے ہوں اور مختلف ماخذ ہوں لیکن بنائے استدلال اس کو قرار دینا بنائے فاسد علی الفاسد ہے ابن العربی و قاضی عیاض نے جو لکھا ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان کے وہی مناسب ہے اس لئے کہ آنحضرتؐ کی عصمت اور اس قسم کے رذائل سے منزہ و مبرا ہونے پر امت کا اجماع ہے اور دلیل قائم ہو چکی ہے۔ نعوذ باللہ نہ ایسی بات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں آسکتی ہے اور نہ زبان پر کہ پیغمبر ہو کر عمداً یا سہواً خدا پر جھوٹ باندھیں۔ یہ تو عقلاً و عرفاً بھی محال ہے اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو بہت سے مسلمان مرتد ہو جاتے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ اور جو مسلمان وہاں موجود تھے۔ ان سے یہ واقعہ مخفی کیونکر رہا۔"[2]

حافظ ابن حجر نے اسی وجہ سے ایک مقام پر خود کہا ہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اثنائے قراءت میں شیطان کا القا کرنا نہ تو از روئے عقل صحیح ہے اور نہ از روئے نقل۔"[3]

از روئے عقل اس لئے نہیں کہ جس نے یہ جائز رکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بتوں کی تعظیم کی اس کا یہ قول کفر ہے۔ اس لئے کہ بداہتہً معلوم ہے کہ آپ کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ بتوں کا ازالہ ہو۔ اگر اس کو جائز سمجھیں تو شریعت سے امن و حفاظت اٹھ جائے اور تمام احکام و آئین اسلام میں ماننا پڑے کہ ایسے ہی ہیں اور خدا کا یہ قول غلط ہو جائے کہ :۔

---

[1] فتح الباری، جلد ۸ صفحہ ۳۳۳۔ [2] عینی، جلد ۹ صفحہ ۴۱۔ [3] فتح الباری، جلد ۸ صفحہ ۲، ۴، ۳، ۷، ۴۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔

اے پیغمبر تمہارے پروردگار نے جو تم پر اتارا ہے اس کی تبلیغ کرو، اور اگر تم نے نہ کی تو پیغامبری نہ کی اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچائے رہے گا۔ (سورہ ۵ رکوع ۹ آیت ۶۲)

اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ وحی میں کم کرنا یا بڑھانا دونوں یکساں ہے۔

نقلاً یہ واقعہ اس لئے صحیح نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے۔

و لو تقول علینا بعض الاقاویل لاخذنا منه بالیمین ثم لقطعنا منه الوتین

ہم پر اگر وہ بعض باتیں گڑھ کر کہتا تو ہم اس سے مواخذہ کرتے اور اس کے دل کی رگ کاٹ دیتے۔

(سورہ ۶۹۔ رکوع اول۔ آیت ۱۹ و ۲۰)

اور دوسری آیت میں ہے:۔

قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۔

اے پیغمبر کہدو کہ یہ مجھ سے کہاں ممکن کہ وحی کو میں اپنے جی سے بدل دوں مجھ پر جو وحی آتی ہے اسکی پیروی کرتا ہوں۔

خود اسی سورۃ النجم میں ہے:۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۔ (سورہ ۵۳۔ رکوع ۲۔ آیت ۱ و ۲)

پیغمبر احکام الٰہی میں اپنی خواہش سے نہیں بولتا بلکہ اس کا کلام وحی ہوتا ہے۔

اس آیت کے بعد اگر تلک الغرانیق العلیٰ پڑھتے اور بتوں کی تعریف کرتے تو اسی وقت اللہ کی تکذیب ہوجاتی اور یہ کوئی مسلمان نہیں کہہ سکتا۔

(۵)

حدیث میں ہے کہ محمد بن اسحاق بن خزیمہ سے اس قصہ کی بابت استفسار کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "اس کو بے دینوں نے وضع کیا ہے۔ اور پھر اس کے ابطال میں ایک کتاب بھی تصنیف کی۔"

بیہقی نے فرمایا ہے "کہ حدیث سے یہ قصہ ثابت نہیں" اس کے جتنے راوی ہیں بیہقی نے سب میں کلام کیا ہے اور سب کو مطعون ٹھیرایا ہے[1]۔

حدیث میں صرف اس قدر ابن مسعود سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ النجم کو پڑھ کر سجدہ کیا، بجز ایک قریشی سردار کے کہ اس نے مٹھی بھر کنکری یا مٹی اٹھا کر پیشانی پر مل لی" عبد اللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ وہ بحالت کفر قتل ہوا یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کی ہے

اور ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ النجم کے آخر میں سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ مسلمان و کافر جن و انس یعنی سب نے سجدہ کیا۔ یہ حدیث بخاری نے روایت کی ہے

ان روایات صحیح میں کہیں نہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ کہے یا پڑھے تھے۔

جو واقعہ مفسرین نے اس قصہ میں ابن عباس سے روایت کیا ہے تو ابن عباس سے اس کا راوی کلبی ہے اور وہ نہایت ضعیف بلکہ متروک و نا قابل اعتبار ہے۔ ایک دوسری سند سے نحاس نے بھی اس کو روایت کیا ہے جس کے راوی واقدی ہیں، احدیث میں ان کے نام ہی کا آنا اس حدیث کے بے سروپا ہونے کے لئے کافی ہے۔

امام بزار کہتے ہیں ہم نہیں جانتے کہ یہ حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بسند متصل مروی ہو"

ابن کثیر کہتے ہیں "بہت سے مفسرین نے قصہ غرانیق بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ اکثر مہاجرین رض حبشہ سے اس گمان کی وجہ سے لوٹ آئے کہ مشرکین مسلمان ہو گئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کی سندات کے جتنے طریق ہیں سب مرسل ہیں، میں نے کوئی بھی صحیح طور پر مستند نہیں دیکھا"

خلاصہ یہ کہ اس باب میں جتنی روایتیں ہیں سب یا تو مرسل ہیں، اور یا منقطع السند ہیں جن میں ایک بھی قابل استدلال نہیں۔ جن صاحبوں کو یہ تمام حدیثیں دیکھنا ہوں وہ سیوطی کی در منثور میں دیکھیں[2]۔

---

[1] رازی جلد ۶ صفحہ ۲۴۵ و ۲۴۶/ [2] فتح البیان جلد ۲ صفحہ ۱۸۰ و ۱۸۱۔

کلام القرآن

(از جناب مولوی اکرم علی محمدی صاحب)

قرآن مجید کی آیات کو روزمرہ کی بول چال میں رواج دینے کی تجویز، ایک عمدہ تجویز ہے جسے بعض احباب نے پیش کیا ہے۔ اب اس چیز کا رواج مسلمانوں سے اٹھ گیا ہے۔ مگر ایک زمانہ میں جب کہ قرآن سے مسلمانوں کا شغف بہت بڑھا ہوا تھا قرآنی آیات اور قرآنی الفاظ بکثرت زبانوں پر چڑھ گئے تھے۔ اور عام طور پر بول چال میں استعمال ہوتے تھے۔ بعض بزرگوں کے متعلق تو مشہور ہے کہ وہ آیات قرآن ہی میں بول چال کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابن المبارک نے خود اپنا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ جو ایک ضعیفہ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ سفر حج سے واپسی پر ایک سن رسیدہ خاتون سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اس کو سلام کیا تو اس نے جواب دیا۔ سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيمٍ۔ پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی:۔

ابن المبارک۔ آپ کس شغل میں ہیں؟

ضعیفہ۔ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ (اعراف) یعنی جس کو اللہ نے بھٹکا دیا ہو اس کے لئے کوئی رہبر نہیں (مطلب یہ تھا کہ میں راستہ بھول گئی ہوں)۔

ابن المبارک۔ آپ کہاں جانے کا ارادہ رکھتی ہیں؟

ضعیفہ۔ سُبْحَانَ الَّذِيْ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى (بنی اسرائیل) یعنی پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندے کو ایک رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گیا (اس سے معلوم ہوا کہ وہ حج سے فارغ ہو کر بیت المقدس جانا چاہتی تھیں)

ابن المبارک۔ آپ یہاں کتنے روز سے مقیم ہیں؟

ضعیفہ۔ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا (مریم) یعنی مسلسل تین راتیں گذر گئی ہیں۔

ابن المبارک۔ میں آپ کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں دیکھتا؟

ضعیفہ۔ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ۔ (شعراء) یعنی خدا ہی مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔

ابن المبارک۔ اس جنگل میں وضو کیسے کرتی ہوں گی؟

ضعیفہ۔ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا (مائدہ) یعنی حکم ہے کہ اگر پانی نہ ملے تو مٹی سے تیمم کر لیا کرو۔

ابن المبارک۔ میرے پاس کھانا ہے۔ آپ نوش فرمائیں گی؟

ضعیفہ۔ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ۔ (بقرہ) یعنی روزوں کو رات آنے تک پورا کرو۔ (مطلب یہ تھا کہ میں روزے سے ہوں)۔

ابن المبارک۔ مگر یہ رمضان کا مہینہ تو نہیں ہے

ضعیفہ۔ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاکِرٌ عَلِیْمٌ۔ (بقرہ) مطلب یہ تھا کہ یہ نفل روزہ ہے۔ رضاکارانہ رکھا گیا ہے۔

ابن المبارک۔ سفر میں تو اللہ نے افطار کی اجازت دی ہے۔ پھر آپ روزے کی تکلیف کیوں اٹھاتی ہیں؟

ضعیفہ۔ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (بقرہ) اگر تم سمجھ سے کام لو تو معلوم ہو جائے کہ روزہ رکھنا تمہارے لئے اچھا ہے۔

ابن المبارک۔ میں جس طرح بات کرتا ہوں اس طرح آپ کیوں نہیں کرتیں؟

ضعیفہ۔ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ (ق) آدمی کی زبان سے جو

لفظ بھی نکلتا ہے اس کی نگرانی کے لئے ایک فرشتہ تیار بیٹھا ہے۔

ابن المبارک۔ آپ کس قبیلے سے ہیں؟

ضعیفہ۔ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل) جس بات کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ۔ کان، آنکھ، دل سب سے سوال کیا جائے گا۔

ابن المبارک۔ معاف فرمایئے۔ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی کہ ایسا سوال کیا۔

ضعیفہ۔ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ (یوسف) اب تم پر کچھ سرزنش نہیں اللہ تمہیں معاف کرے۔

ابن المبارک۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو اپنی اونٹنی پر بٹھا دوں تاکہ قافلہ سے جا ملیں۔

ضعیفہ۔ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ۔ (البقرہ) تم جو نیکی بھی کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے۔

چنانچہ وہ ضعیفہ سوار ہو گئیں اور یہ آیت تلاوت کی:۔ سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (زخرف)۔

ابن المبارک فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں بلند آواز سے اشعار پڑھ کر اونٹ کو دوڑانے لگا تو اس ضعیفہ نے مجھ کو تنبیہ فرمائی فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ۔ (مزمل) جہاں تک ہو سکے قرآن پڑھو۔

آخر ہم چلتے چلتے قافلے سے جا ملے میں نے پوچھا آپ کے رشتہ دار کون کون ہیں؟

ضعیفہ۔ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (کہف) اس سے معلوم ہوا کہ قافلے میں ان کا سامان اور ان کے بیٹے ہیں۔

ابن المبارک۔ آپ کے بیٹے کیا کام کرتے ہیں؟

ضعیفہ۔ وَعَلٰمٰتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ (نحل) مطلب یہ کہ قافلہ والوں کے رہبر ہیں۔

ابن المبارک۔ ان کے نام بتائیے۔

ضعیفہ۔ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ يٰيَحْيٰى۔ خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ۔

حضرت ابن المبارکؒ سمجھ گئے کہ ان کے بیٹے ابراہیم، موسیٰ اور یحییٰ نامی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے قافلہ میں ان لوگوں کے نام لے کر پکارا اور وہ اپنی ماں کے گرد جمع ہو گئے۔ ماں نے بیٹوں کو خطاب کر کے کہا۔

فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ۔ (کہف) تم اپنے میں سے کسی کو یہ سکہ دیکر شہر کی طرف بھیجو کہ وہ دیکھے کس کے ہاں اچھا کھانا ہے۔ اور اس سے کھانا لے آئے۔

اس حکم کے مطابق ایک لڑکا بستی میں گیا اور کھانا لے آیا۔ ابن المبارکؒ کہتے ہیں کہ میں نے ان سے کہا کہ کھانا کھانے سے پہلے مجھ کو ان اعجوبہ روزگار ضعیفہ کے حالات بتاؤ۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہماری ماں ہیں۔ چالیس برس ہو چکے ہیں کہ انہوں نے بجز آیات کلام اللہ کے اور کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالا ہے۔ جو کچھ گفتگو کرتی ہیں۔ قرآن ہی سے کرتی ہیں۔ یہ سن کر میں ششدر رہ گیا۔ اور یہ کہتا ہوا انکے خیموں سے واپس ہوا کہ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

آج دنیا میں سینکڑوں ہزاروں علما اور حفاظ قرآن موجود ہیں۔ مگر کلام اللہ پر اتنے عبور کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔

باغ جنت

(از مولانا عبداللہ العمادی)

(۱)

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ یہ جنت تو وہ ہے جو مومنین کو بعد موت نصیب ہوگی اس پر ہم سب کا ایمان ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور جنت بھی ہے جس کا اسی دنیا سے تعلق ہے۔

سورۂ بقر کے دوسرے رکوع آیت نمبر ۱۲ میں نیک کردار ایمانداروں کو بشارت دیگئی ہے کہ ان کے لئے باغ ہوں گے۔ جاری نہریں ہوں گی۔ پاکیزہ بیویاں ہوں گی جب کوئی میوہ ملے گا تو عام روایت کے مطابق اس کو نیا دیکھکر طبیعت رک نہ جائے گی کہ نہ معلوم کیسا ہو کیسا نہ ہو۔ جتنے میوے ہوں گے۔ صورت میں سب یکساں ہوں گے اور مزے میں ہر ایک کے ذائقے جدا جدا نکلیں گے کہ یکساں ہونے سے طبیعت مانوس رہے گی اور ذائقہ میں تفاوت سے سب میں نیا مزہ آئے گا۔ یہ حالت پائدار ہوگی اور یہ نیک بندے اسی حالت میں ہمیشہ رہیں گے۔ مفسرین نے اس کی تشریح یوں کی ہے۔

الف۔ باغ سے مراد باغ بہشت ہے [۱]

ب۔ بہشت کے جتنے درخت ہوں گے جڑ سے شاخ تک برابر و باترتیب یکساں ہوں گے [۲]

---

[۱] روی ابن جریر قال حدثنا کریب عن الاشجعی عن سفیان عن عمرو بن مرۃ عن مسروق قال نخل الجنۃ نضید من اصلہا الی فرعہا وثمرہا امثال القلال کلما نزعت ثمرۃ عادت مکانہا اخری وماءہا یجری فی غیر اخدود۔ [۲] عن مجاہد قال حدثنا یزید قال خبرنا مسعر بن کدام عن عمرو بن مرۃ عن ابی عبیدۃ لنحوہ۔

ج۔ درختوں کے میوے مٹکے برابر ہوں گے [1]

د۔ جہاں کوئی میوہ توڑا گیا کہ فوراً دوسرا میوہ وہاں لگ جائے گا۔ [2]

ھ۔ باغ بہشت میں بغیر نالیوں کے پانی رواں رہے گا۔ [3]

و۔ باغ بہشت کے خوشے بارہ بارہ گز کے ہوں گے۔ [4]

ز۔ درخت ایسے ہوں گے کہ ان کے سایہ میں مسافر سو برس تک چلا جائے اور پھر بھی سایہ طے نہ ہو۔ [5]

ح۔ باغ بہشت میں جب کوئی میوہ لے کر کھانا چاہے گا تو وہ میوہ اس کے منہ تک نہ پہونچنے پائے گا۔ کہ خدا تعالیٰ ویسا ہی دوسرا میوہ بجائے اس کے لادے گا [6]

ان کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سن لینے کی بات ہے:۔

لایشبہ شئی مما فی الجنۃ مافی الدنیا الا الاسماء [7]　　بہشت کی چیزوں میں سے کوئی چیز دنیا کی چیزوں سے اگر مشابہ ہوگی تو برائے نام مشابہ ہوگی

دوسری روایت میں ہے:۔

لیس فی الدنیا مما فی الجنۃ الا الاسماء [8]　　بہشت کی چیزوں میں سے دنیا میں کچھ نہیں ہے اگر ہے تو نام ہی نام ہے

ایک اور حدیث میں ہے:۔

لیس فی الدنیا من الجنۃ شئی الا الاسماء　　نام کے سوا دنیا میں بہشت کی اور کوئی چیز نہیں ہے [9]

---

[1] عن محمد بن بشار قال حدثنا ابن مهدی قال حدثنا سفیان قال سمعت عمرو بن مرۃ یحدث عن ابی عبیدۃ فذکر مثلہ۔
[2] عن مسروق و ابی عبیدۃ۔ [3] عن مسروق و ابی عبیدۃ۔ [4] اورد النیسابوری والخطیب الشربینی وغیرھما حدیثا فی صفۃ ثمار الجنۃ وعناقیدھا نقلا "العنقود اثنا عشر ذراعا" [5] قال النیسابوری۔ "یرون الشجرۃ یسیر الراکب فی ظلہا مائۃ عام لا یقطعہ" [6] زعم الخطیب الشربینی فی تفسیرہ المسمی بالسراج المنیر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال" والذی نفس محمد بیدہ ان الرجل من اھل الجنۃ یتناول الثمرۃ لیاکلہا فما ھی واصلۃ الی فیہ یبدل اللہ مکانہا مثلہا۔
[7] ابن جریر عن محمد بن بشار قال حدثنا مؤمل قال جمیعا حدثنا سفیان عن الاعمش عن ابن عباس رض
[8] ابن بشار فی حدیثہ عن مؤمل [9] ابن جریر عن عباس بن محمد قال حدثنا محمد بن عبید عن الاعمش۔ عن ابی ظبیان عن ابن عباس الخ۔

بہرحال اصل آیت یوں ہے :-

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۔ وَلَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ (سورہ بقرہ آیت ۲۱ ۔ رکوع ۲)

اے پیغمبر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل (بھی) کئے ان کو خوشخبری سنا دو کہ ان کے لئے (بہشت) کے باغ ہیں جن کے تلے نہریں (پڑی) بہ رہی ہوں گی - جب ان کو ان میں کا کوئی میوہ کھانے کو دیا جائیگا تو کہیں گے - تو ہم کو پہلے بھی (کھانے کے لئے) مل چکا ہے اور (یہ اس لئے کہیں کہ) انکو ایک ہی صورت و شکل کے میوے ملا کریں گے اور وہاں انکے لئے بیویاں ہوں گی پاک و صاف اور وہ ان (باغوں) میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے [1]

(۲)

اس آیت میں کئی باتیں قابل تنقیح ہیں -

الف - جنت (باغ) سے کیا مراد ہے ؟

ب - هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ (یہ تو وہی) جو ہمیں پہلے نصیب ہو چکا ہے) سے کیا مراد ہے ؟

ج - وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (میوہ ان کو یکساں دیا جائیگا) سے کیا مراد ہے ؟

د - هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (وہ ان باغوں میں ہمیشہ رہیں گے) سے کیا مراد ہے ؟

الف - تمام مفسرین نے جنت سے بہشت مراد لی ہے حتیٰ کہ سید احمد خاں نے بھی اسی کو صحیح مان کر آیت کے مفہوم کو واقعات بعد الموت سے وابستہ کیا ہے - یعنے نیک کردار ایمان والوں کو یہ نعمتیں

[1] یہ ترجمہ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم سے ماخوذ ہے - مولوی صاحب نے جنت کا ترجمہ باغ کیا ہے مگر اس کے ساتھ بہشت کا لفظ بھی اضافہ کر دیا ہے آیۃ میں میوہ کھانے (کھانے) کا کچھ تذکرہ نہیں ہے اور اس کے لئے کوئی لفظ وارد نہیں ہے - لیکن مطلب سمجھانے کے لئے جناب موصوف نے اس کو بڑھا دیا ہے - خلدون کا ترجمہ محض لطف کلام کے لئے "ہمیشہ ہمیشہ" کیا ہے حالانکہ یہ ترجمہ اگر ہو سکتا ہے تو خٰلِدُوْنَ اَبَدًا کا ہو سکتا ہے -

جیتے جی نہیں گی مرنے کے بعد ملیں گی خاتمہ آیت (ھُمۡ فِیۡھَا خٰلِدُوۡنَ) سے یہ خیال اور بھی پختہ ہو گیا کیوں کہ بظاہر خلود کے معنی ہمیشگی کے ہیں اور دنیا کی زندگی میں کوئی ایسی نعمت موجود نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے جس کے لئے ہمیشگی و بقائے دوام ممکن ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ خدا کے فضل سے جن کو بہشت ملے گی وہ ہمیشہ پر لطف زندگی بسر کریں گے اور جو نعمتیں انہیں ملیں گی وہ سب دوامی ہوں گی البتہ سید صاحب نے اتنی بات بڑھائی ہے کہ بہشت اور اس کی نعمتوں کی حقیقت و ماہیت کچھ اور ہے۔ ان کی رائے بہشت اور اس کی نعمتوں کے بیان کرنے سے "صرف اعلیٰ درجہ کی راحت کا بقدر فہم انسانی خیال پیدا کرنا مقصود تھا۔ نہ واقعی ان دونوں چیزوں کا دوزخ و بہشت میں موجود ہونا"۔ اس لئے کہ " یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا کی ہوئی ہے۔ اس میں سنگ مرمر کے اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں۔ باغ میں سرسبز شاداب درخت ہیں۔ دودھ اور شراب و شہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے ساقی اور ساقنین نہایت خوبصورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں شراب پلا رہی ہیں۔ ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے۔ ایک نے ران پر سر دھرا ہے۔ ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے ایک نے لب جان بخش کا بوسہ لیا ہے۔ کوئی کسی کونے میں کچھ کر رہا ہے کوئی کسی کونے میں۔ کچھ ایسا بیہودہ پن ہے جس پر تعجب ہوتا ہے۔ اگر بہشت یہی ہو تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں[۵۲]۔

ب ۔ ھٰذَا الَّذِیۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ کی تاویل میں سب نے یہی لکھا ہے۔ کہ جب کسی کو نیا پھل کھانے کو دیا جائے جو اس نے کبھی نہ دیکھا ہو تو اس کے کھانے سے رکتا ہے کہ نہیں معلوم کیا ہے۔ جنتیوں کو جو ایک ہی صورت کے پھل ملیں گے تو وہ ان کے کھانے میں تامل نہیں کر

---

۵۱ تفسیر القرآن (طبع لاہور) جلد ۱ صفحہ ۴۳ ۵۲ ایضاً جلد ۱ صفحہ ۴۳۔

سکتے۔جانتے ہیں کہ ایسا تو ہم پہلے بھی کھا چکے ہیں۔ہاں شاید صورت کے دہوکہ میں اگرچنداں لالچ بھی نہ آئے۔کہ چلو اچو ایکبار خور دندلس۔تو چکھنے کے بعد دوسرا ذائقہ ملے گا۔ اور ان کے دل زیادہ خوش ہوں گے کہ خلاف توقع مزہ ملا" یہ تو جسمانیت اور مادیت کی باتیں ہوئیں۔لیکن امام رازی کی رائے میں ان تمام باتوں کا تعلق روحانیت سے ہے جسمانیت کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے۔فرماتے ہیں۔

فی الآیة قول ثالث علی لسان اهل المعرفة وهو ان کمال السعادة لیس الا فی المعرفة ذات الله تعالی و معرفة صفاته ومعرفة افعاله من الملائکة الکروبیة والملائکة الروحانیه وطبقات الارواح وعالم السموٰت وبالجملة یجب ان یصیر روح الانسان کالمرآة المحاذیة العالم القدس ثم ان هٰذه المعارف تحصل فی الدنیا ولا یحصل بها کمال الالتذاذ والابتهاج لما ان العلائق البدنیة تعوق عن ظهور تلك السعادة فاذا ازال هٰذا العائق حصلت السعادة العظیمة و الغبطة الکبری۔ فالحاصل ان کل سعادة روحانیة یجدها الانسان

آیت میں اہل معرفت کی زبان سے ایک تیسری بات بھی مذکور ہے۔اور وہ یہ ہے کہ کمال نعمت اور سعادت صرف خدا کی ذات وصفات وافعال کے پہچاننے میں ہے کہ کرّوبیان عالم بالا وفرشتگان روحانی و طبقات ارواح وعالم سمٰوات کے متعلق انسان کو شناسائی حاصل ہو۔اور لازم ہے کہ اس کی روح ایک ایسے آئینہ کے مماثل ہو جائے۔جو عالم قدس کے ٹھیک سامنے ہو۔یہ معرفت دنیا میں بھی حاصل ہوتی ہے لیکن اس میں پوری لذت اور کافی خوشی نہیں ہوتی اس لئے کہ جسمانی تعلقات اس لذت و سعادت کے ظاہر ہونے میں سنگ راہ بن جاتے ہیں اور اگر یہ روک اُٹھ جائے تو اصلی وحقیقی لُطف حاصل ہو۔ماحصل یہ ہے کہ جو روحانی نعمتیں اور لذتیں انسان کو مرنے کے بعد حاصل ہوں گی تو وہ کہے گا کہ یہ وہی نعمتیں ہیں جو دنیا میں بھی حاصل

بعد الموت فانہ یقول ھٰذہ ھی التی کانت حاصلۃ فی الدنیا الا انھا فی الدنیا ما افادت اللذۃ و البھجۃ والسرور وفی الاخرۃ افادت ھذہ الاشیاء لزوال العایق لہ

تھیں۔ مگر دنیا میں یہ بات نہ تھی کہ وجہ سے مزہ و دلچسپی و خوشی ہوتی ہو۔ آخرت میں یہ سب باتیں حاصل ہوگئیں اس لئے کہ جو روک تھی وہ مٹ گئی لہ

ج۔ واتوا بہٖ مُتَشَابِهًا کے معنی تو یہی لیے گئے ہیں کہ اہل جنت کو جو میوے ملیں گے وہ سب کے سب شکل و صورت میں یکساں ہوں گے اور دنیا کے میووں سے ان کی شکلیں ملتی جلتی ہوں گی۔ لیکن حسن بن الحسن البصری و قتادہ و ابن جریج سے متعدد حدیثیں اس مفہوم کی بھی روایت کی گئی ہیں کہ بہشت کے میووں کا ہر ایک حصہ اور ہر ایک جزو دوسرے جزو کے متشابہ (ملتا جلتا) ہوگا۔ یعنے جنت کے میوے چھلکے سے لے کر مغز تک بے داغ و بے عیب ہوں گے دنیاوی میوں کی سی کیفیت نہ ہوگی کہ میوے کا کچھ حصہ تو اچھا ہوتا ہے اور کچھ ناقص رہتا ہے لہ۔ قاضی بیضاوی نے اس جسمانی کیفیت کو بھی روحانیت پر محمول کیا ہے لکھتے ہیں:-

ان للآیۃ الکریمۃ محملا اخر وھو ان مستلذات اھل الجنۃ فی مقابلۃ ما رُزِقُوا فی الدنیا من المعارف والطاعات متفاوتۃ فی اللذۃ بحسب تفاوتھا فیحتمل ان یکون المراد من ھٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا انہ ثوابہ ومن تشابھما تماثلھما فی الشرف والمزیۃ وعلو الطبقۃ فیکون

آیت کریمہ کا ایک اور مطلب بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ معرفت و عبادت کے ضمن میں جو مزے دنیا میں حاصل تھے ان کے مقابلہ میں بہشت کے مزوں اور لذتوں میں فرق ہوگا ہو سکتا ہے کہ آیۃ "یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے نصیب ہو چکا ہے" سے مراد دنیاوی عبادت و معرفت کا ثواب ہو یعنی جو لذت دنیا میں خدا کی عبادت و معرفت میں چکھی تھی

لہ تفسیر کبیر (طبع خیریہ مصر ۱۳۰۷ھ) جلد ۱ صفحہ ۲۴۴ - لہ تفسیر ابن جریر (طبع میمنیہ مصر) جلد ۱ صفحہ ۱۳۲ ۱۳۵

هٰذا فی الوعد نظیر قوله" ذوقوا ماکنتم تعملون"۔ فی الوعید ہے بہشت کی لذت اس سے بڑھ کر ہوگی، اور ان" کو میوہ یکساں دیا جائے گا" میں یکساں ہونا مقصود ہو۔
اس صورت میں یہ وعدہ اس وعید کی نظیر ہوگا جس میں دھمکی دی گئی ہے کہ اب اپنے کیے کو چکھو"[۵۱]
اور خطیب شربینی بھی اس قول میں قاضی بیضاوی کے ہم زبان ہیں۔[۵۲]

د۔ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ کا مطلب بالاتفاق یہی بیان کیا گیا ہے کہ اہل بہشت کی ہمیشہ انہیں نعمتوں میں بسر ہوگی اور اس حالت میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہونے پائے گا۔

(۳)

اس باب میں تحقیقات کا دائرہ صرف پہلی اور آخری تنقیح تک وسیع ہے جس کے ضمن میں آیت کا مفہوم و مدعا بھی واضح ہو جائے گا۔ پہلی تنقیح کا انحصار لفظ جنت کی تشریح پر ہے۔ اور دوسری تنقیح میں هم فیها خالدون پر بحث ہوگی۔

لغت میں جنت کے معنے اس باغ کے ہیں جس کے درخت گھنیرے ہوں شاخ در شاخ و پیچ در پیچ ہوں اور آپس میں لپٹے نظر آئیں۔ اصطلاح میں جنت کو صرف باغ آخرت سے مخصوص سمجھ لیا گیا ہے اور اصل میں حقیقی جنت وہی ہے بھی لیکن کلام اللہ نے آخرت کے باغوں کو بھی جنت کہا ہے اور دنیاوی باغوں کے لئے بھی جنت ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ كُلُوْا مِنْ

اور وہی (قادر مطلق) ہے جس نے باغ پیدا کئے (بعض تو ٹٹیوں پر) چڑھائے ہوئے (جیسے انگور کی بیلیں) اور (بعض نہیں چڑھائے ہوئے اور کھجور کے درخت اور کھیتی جن کے پھل مختلف

---

[۵۱] تفسیر البیضاوی (علی ہامش الخطیب الشربینی) جلد ۱ صفحہ ۹۲۔ [۵۲] تفسیر الخطیب الشربینی جلد ۱ صفحہ ۳۱۔

ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔ (سورۃ الانعام۔ رکوع ۱۷۔ آیت ۱۴۲)

(قسموں کے) ہوتے ہیں۔ اور زیتون و انار (کہ بعض تو صورت و شکل و مزہ میں) ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور بعض نہیں بھی ملتے جلتے (لوگو!) یہ سب چیزیں جب پھلیں تو ان کے پھل (بے تامل) کھاؤ اور (ان نعمتوں کے شکریہ میں) ان کے کاٹنے (اور توڑنے) کے دن حق اللہ (یعنی زکوٰۃ ان میں سے) دے دیا کرو۔ اور فضول خرچی نہ کرو کیونکہ فضول خرچی کرنے والوں کو خدا پسند نہیں کرتا۔

ایک اور مقام پر ہے :-

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۗ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (سورۃ ۶۔ آیت ۹۹ رکوع ۱۲)

اور وہی (قادر مطلق) ہے جس نے پانی اتارا پھر اس کے (بعد ہم ہی) نے اس سے ہر قسم (کی روئیدگی) کے کوئے نکالے پھر کویوں سے ہم نے ہری بھری ٹہنیاں نکال کھڑی کیں کہ ان سے ہم گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے گابھے میں گچھے جو (مارے بوجھ کے جھکے) پڑتے ہیں اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار (ظاہر میں ایک دوسرے سے) ملتے جلتے اور (مزے کے اعتبار) سے ملتے جلتے نہیں (لوگو!) ان میں سے ہر ایک چیز جب پکتی ہے تو اس کا پھل اور پھل کا پکنا (قابل دید ہے۔ اور اس کو نظر غور سے) دیکھو بیشک جو لوگ (خدا پر) ایمان

رکھتے ہیں ان کے لئے ان (سب چیزوں) میں (قدرت خدا کی بہتری) نشانیاں (موجود) ہیں۔

سورہ یٰسٓ میں ہے۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ۔ سورہ ۳۶۔ رکوع ۳) آیت (۲۵ و ۲۶)	اور ان (لوگوں) کے (سمجھنے کے) لئے ہماری (قدرت) کی ایک نشانی مری ہوئی (یعنی پڑتی پڑی ہوئی) زمین ہے کہ ہم نے اس کو (پانی برسا کر) جلا اٹھایا اور اس سے اناج نکالا اسی میں سے یہ (لوگ بھی اپنی قسمت کا) کھاتے ہیں۔ اور (زمین میں ہم نے کھجوروں کے اور انگوروں کے باغ لگائے اور ان میں (پانی کے) چشمے بہائے تاکہ باغ کے پھلوں میں سے یہ (لوگ اپنی قسمت کا) کھائیں اور (معلوم ہے کہ) یہ (پھل) ان کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے نہیں۔ تو کیا یہ (لوگ اس نعمت کا) شکر نہیں کرتے

سورہ قٓ میں ہے:۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۔ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۔ (سورہ ۵۰ رکوع آیت ۱)	اور ہم نے آسمان سے برکت کا پانی اُتارا (اپنے) بندوں کو روزی دینے کے لئے اس (پانی) کے ذریعے سے باغ اُگائے اور کھیتی کا اناج اور (لانبی لانبی کھجوریں جن کی گیلیں خوب گتھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور (نیز) ہم نے مینہ کے ذریعہ سے مری ہوئی (یعنی پڑتی پڑی ہوئی) بستی کو جلا اٹھایا۔ اسی طرح (لوگوں کو) نکلنا ہوگا۔

سورۂ نوح میں ہے۔

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا - يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا -

(سورہ ۷۱ رکوع اول - آیت ۵)

گناہوں کی اپنے پروردگار سے معافی مانگو کہ وہ بڑا بخشنے والا ہے - تم پر موسلا دھار مینہ برسائے گا - اور مال اور اولاد سے تمہاری مدد کریگا اور تمہارے لئے نہریں بہائے گا -

سورۂ مُؤْمِنُوْنَ میں ہے :-

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ - (سورہ ۲۳ - رکوع اول آیت ۸ و ۹)

ہم نے ایک انداز کے ساتھ آسمان سے پانی برسایا پھر اس کو زمین میں (جمع کرکے) ٹھیرائے رکھا - اور ہم اس (پانی) کے (اڑا) لے جانے پر (بھی) قادر ہیں پھر اس (پانی) کے ذریعہ سے ہم نے تمہارے لئے کھجوں اور انگوروں کے باغ بنا کھڑے کئے تمہارے لئے ان میں سے بہت سے میوے پیدا ہوتے ہیں اور ان میں سے (بعض کو) تم کھاتے (بھی) ہو -

سورۂ شعراء میں ہے :-

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّ كُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ (سورہ ۲۶ رکوع ۴ آیۃ ۵۸)

غرض ہم نے (فرعون اور اس کی قوم کو) باغوں سے اور چشموں سے اور خزانوں (سے) اور عزت کی جگہ سے نکال باہر کیا -

سورۂ دخان میں ہے :-

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا

یہ لوگ کتنے ہی باغ اور (کتنی ہی) نہریں اور (کتنی ہی کھیتیاں) (اور کتنے ہی) عمدہ عمدہ مکانات اور (کتنے ہی)

فِیْھَا فَاکِھِیْنَ ۔ کَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰھَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ فَمَا بَکَتْ عَلَیْھِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا کَانُوْا مُنْظَرِیْنَ ۔ (سورہ ۴۴ رکوع اول آیت ۱۳ و ۱۴)

آرام و آسائش کے) سامان چھوڑ مرے جن میں مزے اڑایا کرتے تھے (واقع میں) ایسا ہی (ہوا) اور ہم نے دوسرے لوگوں کو اس (تمام ساز و سامان) کا وارث بنا دیا تو ان لوگوں پر آسمان و زمین (کسی) کو (بھی تو) رقت نہ آئی اور نہ ان کو توبہ و ندامت (ہی) کی مہلت ملی۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے :۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْبُوْعًا اَوْ تَکُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْھٰرَ خِلٰلَھَا تَفْجِیْرًا (سورہ ۱۷ رکوع ۱۰ آیت ۹۲)

اور انہوں نے کہا کہ ہم تو اس وقت تک تم پر ایمان لانے والے نہیں کہ (یا تو ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ (بہا) نکالو یا کھجوروں اور انگوروں کا تمہارا کوئی باغ ہو اور اس کے بیچ بیچ میں تم (بہت سی) نہریں جاری کر دکھاؤ۔

سورۂ فرقان میں ہے :۔

وَقَالُوْا مَالِ ھٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَلَكٌ فَیَکُوْنَ مَعَهٗ نَذِیْرًا ۔ اَوْ یُلْقٰٓی اِلَیْهِ کَنْزٌ اَوْ تَکُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ یَّاْکُلُ مِنْھَا وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (سورہ ۲۵ رکوع اول آیت ۵)

اور انہوں نے (یعنی کافروں نے) کہا کہ یہ کیسا پیغمبر ہے کہ کھانا کھاتا اور بازاروں میں پھرتا ہے اس کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا کہ اس کے ساتھ ہو کر (وہ بھی لوگوں کو عذاب خدا سے) ڈراتا ۔ یا اس پر کوئی خزانہ ڈالدیا ہوتا (یا زیادہ نہیں تو) اس کے پاس ایک باغ (ہی) ہوتا کہ اس سے کھاتا (پیتا) اور یہ ظالم (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم بس ایسے آدمی کے پیچھے ہو لئے جس پر کسی نے جادو کر دیا ہے ۔

سورہ کہف میں ہے :-

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ ..... كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا ...... وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ..... وَلَوْلَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ..... فَعَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ ...... (سورہ ۱۸ رکوع ۵ آیت ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۳۰)

اور ان لوگوں سے ان دو شخصوں کی مثال بیان کرو جن میں سے ایک کو ہم نے دو باغ دے رکھے تھے .... دونوں باغ اپنے اپنے پھل لائے .... وہ باغ میں ایسی حالت میں داخل ہوا کہ اپنے نفس پر آپ ہی ظلم کر رہا تھا .... اور جب تو اپنے باغ میں آیا تو تو نے (یوں) کیوں نہ کہا کہ یہ (سب) تو خدا کے چاہنے سے ہوا ہے ورنہ مجھ میں تو بے مدد خدا کچھ بھی طاقت نہیں ...... تو عجب نہیں میرا پروردگار تیرے باغ سے (بھی) بہتر باغ مجھکو عطا فرمائے۔

سورۂ سبا میں ہے :-

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ...... وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ - (سورۂ ۳۴ - رکوع ۲ - آیت ۱۳ و ۱۴)

قوم سبا کے لئے ان کے (اپنے ہی) گھروں میں (قدرت خدا کی، البتہ ایک (بڑی) نشانی (موجود) تھی - داہنے ہات اور بائیں ہات دو دو باغ تھے .... اور ہم نے ان کے دو باغوں کے بدلے میں دو باغ (تو) دیئے مگر ایسے کہ ان کے پھل بدمزہ تھے اور ان (کچھ) جھاؤ تھا اور قدرِ قلیل بیری۔

باغ بہشت کے حق ہونے میں کلام نہیں جس کا وعدہ موت کے بعد ہے یہاں کہنے کی بات صرف اتنی ہی ہے کہ ان آیتوں میں جنت سے مراد باغ دنیا ہے - اور اگر اسی ضمن میں وہ آیتیں

بھی شامل کر لی جائیں جن میں حضرت آدم و حوا (علیہما السلام) کے جنت میں داخل ہونے اور نکلنے کا تذکرہ ہے تو نظیروں کا شمار نہایت وسیع ہو جاتا ہے اس لئے کہ بعض نامور محققین نے حضرت آدم کی جنت کو بھی باغ دنیا قرار دیا ہے۔ اس معنے کے تسلیم کرنے پر خدا کے مطیع بندوں (مسلمانوں) کو آیت مذکورۂ بالا میں جس جنت کی بشارت دی گئی ہے وہ ایماندار و نیک کردار ہونے کی شرط پر دنیا میں بھی انہیں مل سکتی ہے اور اگر چاہیں تو پکے مسلمان بن کر اسی دنیا میں اپنے آپ کو بہشت کا مستحق بنا سکتے ہیں (جس کے بعد بشرط ایمان و عمل صالح اُس بہشت موعود (جنّت آخرت) کے ملنے میں کیا کلام ہے ؎

من کہ در کعبۂ حق منزل و ماویٰ دارم　　گر دہد جائے بفردوس بر نیم چہ شود

لیکن جہاں "آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا" کی دشواریاں درپیش ہوں وہاں کیا یہ ممکن ہے کہ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ۔ (اے ایمان والو اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ) کا خطاب دائرۂ عمل میں آجائے گا اور مسلمان بھی کسی دن مسلمان بن جائیں گے ؎

خواہم از زلف بتاں نافہ کشائی کردن　　فکر دور است ہمانا کہ خطائے بینم

(۴)

دوسری تنقیح هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ یعنے اہل جنّت ہمیشہ اُسی میں رہیں گے (میں خلود (ہمیشگی) پر بڑا زور دیا گیا ہے کہ آیت میں جنت سے اگر جنت دنیا مراد ہوتی تو اس میں ہمیشگی کی شرط کیوں کی جاتی۔ دنیا تو خود ناپائیدار ہے پھر اس کی نعمتیں کیونکر پائدار ہو سکتی ہیں لیکن اصل میں یہ ایک طرح کی غلط فہمی ہے خلود کے معنی بقائے دوام کے نہیں ہیں۔ بقائے طویل کے ہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں۔

قَالَ اصحابنا الخلد هو الثبات الطويل　　ہمارے علماء کہتے ہیں کہ خلود (ہمیشگی) کے معنے دیر

ا؎ سراج المنیر (طبع خیریہ مصر) صفحہ ۴۲۔ جلد ا

سواءٌ دام او لم یدم
واحتجوا فیه بالآیة والعرف
اَمّا الآیة فقوله تعالیٰ خٰلِدِیْنَ
فِیْهَآ اَبَدًا ولو کان التابید داخلاً فی
مفهوم الخلد لکان ذالک تکرارا۔
واما العرف فیقال حبس فلان فلاناً
حبسًا مخلدًا او لانه یکتب فی صکوک
الاوقاف وقف فلان وقفًا مخلدًا[51]

تک پائیدار رہنا ہے چاہے ہمیشہ ہمیشہ رہے یا نہ رہے اس باب میں
قرآن و محاورۂ عرب کی دلیل لاتے ہیں قرآن کی دلیل تو یہ ہے
کہ بہشت میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ لفظ دوام کے معنی
اگر ہمیشگی کے مفہوم ہوتے تو دوبارہ ہمیشہ ہمیشہ کہنا کیا
ضرور تھا۔ محاورہ میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں کو ہمیشہ
کے لئے بند رکھا ہے اور وقف ناموں میں لکھتے ہیں۔ فلاں
شخص نے ہمیشہ کے لئے جائداد وقف کی ہے حالانکہ دنیا
اور اس کی کوئی چیز بھی ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے[51]

قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:۔

الخلد والخلود فی الاصل الثبات المدید
دام او لم یدم ولذٰلک قیل للاثافی والاحجار
خوالد وللجزء الذی یبقی من الانسان
علی حاله ما دام حیًّا خلد ..... بخلاف
ما لو وضع للاعم منه فاستعمل فیه
بذالک الاعتبار کاطلاق الجسم علی الانسان
مثل قوله تعالیٰ: وَمَا جَعَلْنَا لِرَجُلٍ
مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ"[52]

خلد اور خلود اصل میں دیر تک ثابت رہنے کو کہتے ہیں
چاہے یہ کیفیت دوامی ہو یا نہو۔ اسی لئے چولھے اور پتھروں
کو بھی خوالد (ہمیشہ رہنے والے) کہتے ہیں۔ اور انسان کے
جسم کا وہ جزء جو بجائے خود باقی رہتا ہے اسے بھی خلد کہا جاتا
ہے..... لیکن جہاں کہیں عام ترین معنے کے لئے
یہ لفظ رکھا گیا ہو وہاں اسی اعتبار سے استعمال بھی
ہوتا ہے۔ مثلاً یہ آیت ہم نے تجھ سے پہلے کسی شخص کے لئے
ہمیشگی نہیں بنائی ہے[52]

---

[51] تفسیر کبیر، جلد ا صفحہ ۲۲۵،

[52] انوار التنزیل واسرار التاویل للقاضی البیضاوی (علی ہامش السراج المنیر) جلد ا صفحہ ۹۳۔

نظام نیشاپوری نے لفظ خلد کے معنے بقائے دوام کے ہونے کے متعلق یہ بھی تشریح کی ہے کہ صرف معتزلہ نے خلد خلود کے معنے بقائے دوام کے لئے ہیں ورنہ اشاعرہ اہل سنت کا اتفاق ہے کہ اس کے معنے دیر تک ثابت رہنے کے ہیں۔[۵] ہیں ہم اس ضمن میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ خلود کے معنی بقائے دوام نہ بھی مگر دراصل جنت میں بقائے دوام ہی ہوگا اس تاویل کی ضرورت یہ تھی کہ جس کو بہشت نصیب ہوگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نصیب ہوگی لیکن سوال یہ ہے کہ جب قرآن نے جنت کو باغ دنیا کیلئے بھی استعمال کیا ہے۔ اور خلود کے معنی بھی بقائے دوام کے نہیں ہیں تو پھر ان تاویلات کی کیا حاجت ہے؟ اور کیا ضرور ہے کہ اس دنیاوی جنت کی نعمتوں کو بھی روحانی مانا جائے جسمانی نہ مانا جائے؟

اس بیان توضیحی کا نتیجہ یہ ہے:-

(الف) آیت میں مہذب و صالح مسلمانوں کو بشارت دی گئی ہے اور اس بشارت سے پہلے شرط کر دی گئی ہے کہ ان میں اسلامی تقویٰ و تہذیب (کہ حقیقت میں یہی ایک تہذیب ہی اور شائستگی و صلاحیت ہونا ضروری ہے۔

(ب) مدعای بشارت یہ ہے کہ جو مسلمان صالح و نیک کردار اور شریفانہ اخلاق سے آراستہ ہوں گے خدا ان کو جنت اور اس کی نعمتیں عطا کرے گا۔

ج یہ دور ترقی بہت دیر تک قائم رہے گا۔ اور اسی لحاظ سے اس کو خالد کہا جائے گا۔

(۵)

یہ تمہید تھی۔ ناظرین اب اس کے بعد منشاء آیت ملاحظہ فرمائیں۔

آیت میں اسلامی ترقی کے وعدے کو ایمان و عمل صالح سے مشروط کیا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ایمان کے معنے کیا ہیں۔ ایمان یہ نہیں ہے کہ زبان تو لا الٰہ الا اللہ کہہ رہی ہو۔ اور دل میں ؎

صنمے در دل ما یافت راہ   نحن لا نعبد الا ایاہ

کے ناپاک جذبات بھرے ہوں کہنے کو اپنے تئیں مسلمان کہا جائے مگر اسلام کے احکام سے عملاً کچھ علاقہ نہ ہو۔ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ

---

[۵] غرائب القرآن در غائب الفرقان للنظام النیساپوری (علی ہامش جامع البیان لابن جریر الطبری) جلد ا صفحہ ۹۴۔

(صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کی جگہ رسم ورواج کو دیجائے اور مذہبی وقومی پیشوائی کی منزل جو پہلے قرآن کریم کو اور صرف قرآن کریم کو حاصل تھی اب علماء کے قیاسات ومفروضات کو عطا کی جائے۔ ایمان کا مفہوم یہ ہے کہ انسان خدا کی خدائی کا معتقد ہو۔ اور علم النفس میں یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ اعتقاد وہی ہے جس کے آثار انسان کے کردار وگفتار سے ظاہر ہوتے ہیں۔ لہذا وہ ایمان ہرگز ایمان نہیں ہے جس میں بندے کے افعال خدا کے احکام سے بے پروا ہیں۔ قرآن میں جہاں کہیں بھی اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (وہ لوگ جو ایمان لائے) کے الفاظ وارد ہیں ساتھ کے ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (اور انہوں نے نیک کام کئے) بھی موجود ہے[1]۔ اور جن آیات میں اٰمَنَ (ایمان لایا) کا تذکرہ ہے اسی کے بعد وَعَمِلَ صَالِحًا (اور نیک کام کیا) کی شرط بھی لگا دی ہے[2]۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری ایمان کافی نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ حسن عمل بھی لازم ہے۔ سورۂ نور میں ہے

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ۔ قُلْ لَا تُقْسِمُوْا طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔
(سورہ ۲۴- رکوع ۷، آیت ۵۳)

اور انہوں نے اللہ کی بڑی پکی پکی قسمیں کھائیں کہ اگر حکم ہو تو بلا عذر گھر بار سب چھوڑ کر) باہر نکل کھڑے ہوں (ان سے) کہو کہ قسمیں نہ کھاؤ۔ پسندیدہ فرمانبرداری چاہیے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی سب خبر ہے (یعنی جو ایمان کا مدعی ہو اس کو زبانی دعوے نہ کرنے چاہئیں بلکہ عمل سے اپنی ایمانداری کا ثبوت دینا چاہیے)

سورہ حجرات میں ہے :-

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ

ایماندار تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر کسی طرح کا شک وشبہ کیا (۲) اور اللہ کی راہ میں اپنی جان ومال سے کوشش کی (حقیقت میں سچے یہی

---

[1] دیکھو سورہ رعد وشوریٰ مائدہ وفتح وابراہیم وحج ویونس وبقرہ وطلاق وآل عمران ونساء وشعراء ونور وسجدہ وجاثیہ۔

[2] سورہ بقرہ ومائدہ وکہف ومریم وطٰہ وقصص وسبا۔

هُمُ الصَّادِقُوْنَ۔ (سورہ ۴۹۔ رکوع ۲۔ آیت ۱۵) ہیں (یعنی جن لوگوں میں یہ دونوں شرطیں موجود ہوں ان کا ایمان تو سچا ہے اور جو ایسے نہ ہوں وہ جھوٹے بے ایمان ہیں)۔

یہ معیارِ ایمان اگر صحیح ہے۔ اور ضرور صحیح ہے۔ تو ہم میں کتنے ہیں جو ایمان دار کہے جا سکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے ایمان کے دعوے میں سچے ہوتے تو کیا یہ نہ دیکھتے کہ مسلمان کس روز میں گرفتار ہیں اسلامی دنیا پر نامسلمان کیوں کر غالب آتے جاتے ہیں۔ اور ہر ایک برِ اعظم میں مسلمانوں کی کیا گت بن رہی ہے جہالت کی ہم کو شکایت ہے لیکن اس عمارت کی بنیاد خود ہمارے ہاتھوں سے پڑی ہے۔ قومی تنزل کا گلہ ہے مگر اس طوق کو ہمارے اعمال ہی نے گلوگیر بنایا ہے۔ ترقی کی خواہش ہے لیکن ایمان کا دل میں نشان تک نہیں۔ عزت و سربلندی کی تمنا ہے مگر عملِ صالح سے بے پروا ہیں۔ گھر کی بضاعت ہے تو سود خواروں کے لئے وقف ہے۔ ذاتی آمدنی ہے تو بے اصول کاموں میں صرف ہو رہی ہے۔ وقت ہے تو رائیگاں جا رہا ہے نہ دماغ کی کسی طرح کی تربیت کی جاتی ہے۔ نہ دماغی و ذہنی قوتوں کے نشو و نما کے لئے تعلیم دی جاتی ہے۔ نہ قوم کی فلاح مطلوب ہے۔ نہ اخلاق درست ہیں۔ نہ درست کرنے کی فکر ہے۔ اور پھر ان بے اصولیوں کے ہوتے ہوئے ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور اسلام کے جو لوازم ہیں (یعنی ترقی و سربلندی) اُن کے خواہاں رہتے ہیں!!!

یہ سادہ دل بشارتِ قرآں سے شاد ہے مومن نہیں پہ انتم الاعلون یاد ہے

(۶)

بے شبہ قرآن کریم کا وعدہ ہے اور نہایت سچا وعدہ ہے کہ:۔

وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصالحات وَھُوَمُؤْمِنٌ فَلَا یَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا ھَضْمًا (سورہ طٰہٰ۔ رکوع ۶ آیت ۱۱۱) اور جو نیک عمل کرے گا اور وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا تو اس کو نہ کسی طرح کے ظلم و ستم کا خوف ہوگا اور نہ کسی طرح کی حق تلفی کا۔

لیکن اس وعدے کے وفا ہونے کے لئے جو شرط کی گئی ہے کیا ہم اس پر بھی ملتفت ہونا چاہتے ہیں اور دل

کو ایمان دماغ کو تہذیب نفس اور تمام اعضائے جوارح کو عمل صالح کا پابند بنانے پر آمادہ ہیں؟ ہمارے اخبار ہماری قومی حق تلفیوں کے شکوہ سنج رہتے ہیں مظالم کے دادخواہ ہوتے ہیں۔ قوم کی تباہی کا مرثیہ سناتے ہیں اور تلافی کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن کیا سوچنے کی بات نہیں ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ہماری بدبختیوں کا نتیجہ ہے مسلمان ایماندار ہوں۔ نیک کردار ہوں۔ تو نہ ان پر ظلم ہو سکتا ہے اور نہ ان کی حق تلفی ممکن ہے۔ لیکن جب اس خصوصیت سے بیگانہ ہیں تو ظلم و ستم کا گلہ کیا اور حق تلفی کی شکایت کیوں؟ اے نورِ چشم من بجز از کشتہ ندروی ؎

(۷)

عمل صالح کا تعلق صرف ظواہر سے نہیں ہے عمل صالح اگر ہے تو اخلاق کو مہذب رکھنا اور اعمال کو ایسے معیار تقویٰ پر لانا ہے جس سے خود اس کو اور اس کی قوم کو فائدہ پہنچے اور وہ فائدہ بھی منشائے قرآن کے مطابق ہو۔ جو تباہی ہم کو محیط ہے وہ اسی معیار کو نظر انداز کرنے سے لاحق ہوئی ہے دنیا میں نظر کرو دنیا دی ممالک پر نگاہ دوڑاؤ جزائر یونان کو دیکھو۔ جزائر بحر روم کو دیکھو سسلی کو دیکھو۔ سارڈینیا کو دیکھو۔ ہسپانیہ کو دیکھو۔ پرتگال کو دیکھو۔ جنوبی فرانس کو دیکھو۔ جنوبی ایطالیہ کو دیکھو۔ اور پھر بتاؤ کہ ان ممالک کے مسلمان کیا ہوئے اور کہاں گئے۔ الجزائر میں جاؤ جہاں آج کل فرانس کی حکومت ہے اور دیکھو کہ کیسی کیسی مسجدیں کلیسا کی شکل میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ بزرگوں کے مزاروں اور روضوں پر صلیبیں نصب ہیں اور مدرسوں اور خانقاہوں کے مشنری ہاؤس بنے ہوئے ہیں۔ خود اسی ہندوستان کو دیکھو اور بتاؤ کہ قطب مینار جس فاتحانہ عظمت و سربلندی کی داستان سنا رہا ہے تاج محل جس تمدن کا نوحہ خواں ہے قوۃ اسلام جس جلالت و جبروت کی عزا دار ہے جونپور کا پل اور قلعہ اور مسجدیں جس فرد شکوہ کی سوگوار ہیں احمد آباد لاہور کی عبادت گاہیں جس دینداری کا ماتم کر رہی ہیں۔ وہ سب باتیں کیا ہوئیں اور کدھر گئیں ہندوستان اب بھی وہی ہے لیکن اب وہ جاہ و جلال کہاں ہے جو محمد بن قاسم کے ساتھ آیا تھا۔ وہ فلسفہ کہاں ہے جس کی ملا محمود جونپوری نے بنیاد ڈالی تھی۔ وہ فلسفہ کی درسگاہیں کیا ہوئیں جو بہار و جونپور میں قائم تھیں۔ کیا ان سب کے فنا ہونے کا باعث یہی نہیں تھا کہ بزرگوں نے عمل صالح کا جو میراث چھوڑا تھا وہ برباد گیا اور ہم اس سے بے خبر رہے ہم اپنے

اخلاق و عادات کو اگر مہذب بناتے اور مہذب رکھتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ دنیا ہماری غلام نہ ہوتی، اور زمانے پر ہمارا سکہ نہ بیٹھا رہتا۔ ہم ایک ریگستان (عرب) سے نکل کر اپنی اخلاقی طاقتوں کی بدولت ساری دنیا پر چھا گئے تھے اب تقوٰی نہ ہونے کی وجہ سے ساری دنیا میں پھیلے بھی ہیں اور پھر بھی مٹی خراب ہو رہی ہے عبرت پذیر دل کے لئے کیا یہ خون ہو جانے کی باتیں نہیں ہیں اور کیا اس انحطاط کی مصیبتوں میں بھی ہم کو خدا یاد نہ آئے گا۔ اور ہم اپنے ایمان و اخلاق کو محکم نہ بنائیں گے بے شبہ ہم اب بھی ترقی کر سکتے ہیں۔ خدا نے جو وعدے کئے تھے وہ ابتدائی صدیوں کے لئے مخصوص نہ تھے وہ پاک و مقدس وعدے ہمیشہ کے لئے ہیں اور اب بھی ان کا وہی اثر ظاہر ہو سکتا ہے۔ دنیا ہمارے لئے ہے اور دنیا کی تمام علمی و اخلاقی و مادی و روحانی ترقیاں بھی ہمارے ہی لئے ہیں۔ لیکن ان ترقیات کیلئے شرط کیا ہے؟ شرط محض اتنی ہے کہ ہمارے اخلاق و اعمال میں شائستگی و تہذیب و صلاحیت ہونی چاہیئے۔ یہی شرط اگلی قوموں سے بھی ہوئی تھی اور اسی کو خدا نے یاد بھی دلایا ہے کہ :۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ	وہ اگر توراۃ و انجیل کو قائم رکھتے (یعنی ان کے احکام کے پابند ہوتے
وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ	اور وہ جو ان کے پروردگار کی جانب سے ان پر اترا ہے اس
فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ۔	کی پیروی کرتے تو ان کو اتنی نعمت روزی ہوتی کہ اوپر سے
(مائدہ (۵) رکوع ۸۔ آیت ۶۱)	اور پاؤں تلے سے کھاتے (یعنی ہر سمت ان کے لئے نعمت ہی

نعمت ہوتی) لیکن افسوس ہے کہ جس طرح ان اقوام نے اس شرط کو فراموش کر دیا وہی حالت آج ہماری ہے۔ کہ ایمان و عمل صالح کی پابندی پر ہم کو ترقی کی بشارت دی گئی تھی مگر ہم ہیں کہ دونوں کو بھولے اور نظر انداز کئے ہوئے ہیں اور پھر بھی ترقی کے متمنی ہیں کیا یہ کامیابی کی صورتیں ہیں اور کیا ایسی حالت میں ترقی ممکن ہے؟

آیت الکرسی

(از مولانا عبداللہ العمادی)

(۱)

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جو بات بیان کی ہے کھول کر بیان کی ہے۔ اس کو دنیا کے ہر ایک طبقہ کی ہدایت کرنا ہے اس لئے انداز بیان اس قدر واضح شگفتہ اثر ریز اور دل نشین ہے کہ اعلیٰ و ادنیٰ سب اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور نئی فرنگی جمعیت سے لے کر پرانی امیر کافی جماعت تک کو اس کی تعلیمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہے، لیکن دشوار پسند طبیعتیں اتنی ساری توضیح پر بھی قرآن کے مفہوم میں اس قدر مختلف ہیں اور ان اختلافات نے اتنے دور از کار جھگڑے پیدا کر رکھے ہیں کہ ایک ایک کے مقابلہ و تکذیب پر آمادہ ہے۔

یہ اختلافات بیشتر ایسے ہیں جو قرآن کے طرز ادا میں غور نہ کرنے کی وجہ سے واقع ہوئے ہیں۔ قرآن کے انداز بیان و اسلوب کلام میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے پیچیدہ طبیعتیں خود اس کو پیچ در پیچ بناتی جاتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ الفاظ سے مطلب نکالا جاتا فلسفہ کی نظر سے اس میں نکتہ آفرینی کی جاتی ہے اور مضمون میں اور بھی گرہیں پڑتی جاتی ہیں۔

ذوق عشق است کہ دشوار پسند افتاد است
ورنہ سودائے سر زلف تو دشوار نبود

مثلاً:-

قرآن نے ایک مقام پر توضیح کی ہے کہ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (خدا کی کرسی آسمان و زمین کو وسیع ہے) اہل نظر کو کرسی کا مفہوم متعین کرنا تھا اس لیے خوب خوب توجیہیں کی گئیں اور ہر کسے بر حسب فہم گمانے داشت کا نظارہ اچھی طرح آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ یہ اختلافات قابل دید ہیں۔

الف[۱]۔ کرسی اس جگہ کا نام ہے جس پر قدم لٹکاتے ہیں۔

ب[۲]۔ کرسی اس جگہ کا نام ہے جہاں خدا کے پاؤں ٹکتے ہیں یہ جگہ (کرسی) عرش کے روبرو ہے۔

ج[۳]۔ خدا کی کرسی اتنی بڑی ہے کہ آسمان و زمین اس کے جوف میں سما سکتے ہیں۔

د[۴]۔ خدا کا عرش کرسی سے بھی بڑا ہے اور اس قدر بڑا ہے جیسے ایک میدان میں لوہے کا چھوٹا سا حلقہ بے حقیقت سا نظر آ رہا ہو۔

ھ[۵]۔ عرش و کرسی دونوں ایک ہیں۔

و[۶]۔ خدا کی کرسی آسمان کے اوپر ہے۔

ز[۷]۔ خدا کی کرسی زمین کے نیچے ہے۔

---

[۱] عن علی بن مسلم الطوسی عن عبد الصمد بن عبد الوارث عن ابیہ عن محمد بن جحادہ عن سلمۃ ابن کہیل عن عمارۃ بن عمیر عن ابی موسی قال الخ۔

[۲] عن موسیٰ بن ہارون عن عمرو عن اسباط عن السدی۔

[۳] عن السدی۔

[۴] عن یونس عن ابن وھب عن ابن زید عن ابیہ و بروایۃ اخری عن ابی ذر۔

[۵] عن المثنیٰ عن اسحاق عن ابی زھیر عن جویبر عن الضحاک عن الحسن۔

[۶] عن الحسن و قال النیسابوری قد وردت الاخبار بان الکرسی دون العرش و فوق السماء السابعۃ۔

[۷] روی النیسابوری فی رغائبہ عن السدی ان الکرسی تحت الارض۔

۵ - خدا کی کرسی میں زمین و آسمان سب سما سکتے ہیں۔ خدا اس پر بیٹھا کرتا ہے اور اس کرسی میں اس کی پوری سمائی ہو جاتی ہے۔ چار انگل بھی زیادتی نہیں ہونے پاتی۔ اس سے چرچراہٹ کی آواز بھی آتی ہے جس طرح کسی بھاری بھرکم آدمی کے بیٹھنے سے چرچراہٹ پیدا ہوتی ہے۔

ان اختلافات سے کرسی کا مفہوم تو کیا واضح ہوتا خدا کی خدائی میں شک پڑ گیا۔ کرسی کو ایک مقام یا محل مانو۔ خدا کو جسم قرار دو۔ اس کی نشست کے لئے تخت و کرسی بناؤ۔ اور انسان سے خدا کی مشابہت ثابت کرنے کے لئے اس قدر مبالغہ کرو کہ کرسی پر بیٹھنے میں بعض اوقات چولوں سے جو آواز نکلتی ہے اس کی تحقیقات بھی کر چھوڑو۔ اب بات کیا رہ گئی۔ خدا سے ایک یارانہ و اتحاد کا ثبوت دینا باقی تھا۔ شاعری نے اس کی تکمیل بھی کر دی۔ "وہ کہے اللہ ہو اور میں کہوں اللہ ہوں یار"

(۲)

اہل علم کے لئے یہ موقع نہایت نازک تھا۔ انہیں چار و ناچار کسی طرح بات کو سلجھانا پڑا۔ علامہ زمخشری و قفال مروزی نے اس کی نہایت لطیف توجیہ کی ہے صاحب رغائب فرماتے ہیں۔

قیل المقصود من الکلام تصویر عظمة الله وکبریائه ولا کرسی ثمه ولا قعود ولا قاعد واختاره جمع من المحققین کالقفال والزمخشری تقریره انه یخاطب الخلق فی تعریف ذاته وصفاته بما اعتادوا فی ملوکهم فمن ذلك انه جعل الکعبه بیتاً له یطوف الناس به کما یطوفون

بعض لوگ کہتے ہیں کہ کلام کی غرض دراصل خدا کی عظمت و جلال کی تصویر کھینچنا ہے۔ ورنہ حقیقت میں نہ وہاں کرسی ہے نہ نشست ہے اور نہ کوئی بیٹھنے والا ہے۔ اس توجیہ کو قفال و زمخشری جیسے محققوں کی ایک جماعت نے پسند بھی کیا ہے اس کی تقریر یوں ہے کہ خدا اپنی ذات و صفات سے روشناس کرانے کے لئے مخلوقات سے اسی طرح خطاب کرتا ہے جس کے خوگر بادشاہوں کے ساتھ لوگ ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً

---

[۱] عن عبد اللہ بن ابی زیاد القسطوانی عن عبید اللہ بن موسی عن اسرائیل عن ابی اسحاق عن عبد اللہ بن خلیفة

بیوت ملوکهم وامر الناس بزیارته کما یزور الناس بیوت ملوکهم وذکر الحجر الاسود انه یمین الله فی ارضه ثم جعله مقبل الناس کما یقبل ایدی الملوک وکذلک ما ذکر فی القیامة من حضور الملائکة والنبیین والشهداء ووضع الموازین وعلی هذا القیاس اثبت لنفسه عرشا فقال: "الرحمٰن علی العرش استوٰی" ووصف عرشه فقال "وکان عرشه علی الماء" ثم قال: "وتری الملائکة حافین من حول العرش" ثم قال: "ویحمل عرش ربک فوقهم یومئذ ثمانیة" ثم اثبت لنفسه کرسیا و لما توافقنا ان المراد من الالفاظ الموهمة للتشبیه فی الکعبة والطواف والحجر هو تعریف عظمة الله وکبریائه فکذا الالفاظ الواردة فی العرش والکرسی

جس طرح لوگ اپنے بادشاہ کے محل میں آمدورفت رکھتے ہیں، اور اردگرد پھرتے ہیں اسی طرح خدا نے بھی کعبہ کو اپنا گھر قرار دیا ہے کہ اس کا طواف کیا جائے اور سلاطین کے گھروں کی طرح اس کی بھی زیارت ہو۔ حجر اسود کو کہا کہ زمین پر یہ خدا کا داہنا ہاتھ ہے پھر اس کو بوسہ گاہ بنایا اور اسی طرح جیسے کہ بادشاہوں کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہیں۔ قیامت میں فرشتوں، پیغمبروں، اور شہیدوں کا حاضر ہونا اور میزان (ترازو) کا رکھا جانا۔ یہ سب اسی رنگ میں ہے۔ اور اسی انداز میں خدا نے اپنے لئے ایک تخت کا بھی ثبوت دیا ہے۔ اور فرمایا ہے "خدا تخت پر قائم ہے" تخت کی کیفیت بھی بیان کی ہے کہ "خدا کا تخت پانی پر تھا" پھر فرمایا ہے "تو دیکھے گا کہ تخت کے گرد کو فرشتے گھیرے ہوئے ہیں" ایک اور مقام پر ہدایت کی ہے کہ "تیرے پروردگار کے تخت کو اس دن آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے" ان سب کے بعد خدا نے اپنے لئے ایک کرسی کا بھی ثبوت دیا ہے۔ چونکہ ہمارا اتفاق یہ ہے کہ کعبہ، طواف و حجر کے الفاظ جن سے تشبیہ کا وہم پیدا ہوتا ہے اصل میں ان الفاظ سے خدا کی عظمت و کبریائی کو روشناس کرنا مقصود ہے اس لئے عرش و کرسی کے باب میں جو الفاظ وارد ہیں۔ اُن سے بھی یہی مراد ہو گی۔[1]

---

[1] غرائب القرآن و رغائب الفرقان للنیسا پوری (علی ہامش ابن جریر) جلد ۳ صفحہ ۱۹۔۱۸

یہ تاویل ماننے کے قابل ہے لیکن پہلے یہ فیصلہ ہو جانا چاہیئے کہ جن الفاظ کی تاویل کی جاتی ہے وہ آیا واقع میں تاویل طلب ہیں" اور طواف کعبہ۔ بوسۂ حجر اسود۔ قیامت میں فرشتوں پیغمبروں اور شہیدوں کا دربار۔ انسانی اعمال کو تولنے والی ترازو۔ عرش کرسی۔ ان سب کا آیا وہی مفہوم ہے جس کو ہم لازمۂ انسانی سمجھے ہیں"۔ اور خدا کی خدائی کو اُس سے منزّہ و مبرّا مان کر بات بنانے کی فکر میں ہیں اگر یہ فیصلہ ہو گیا تو مسالہ خود بخود واضح ہو جائے گا۔ اور قرص آفتاب کو مشعل لے کر ڈھونڈھنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

(۳)

اس مقام پر ہم کو صرف آیتہ زیر بحث کی تحقیق کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ کرسی کے لفظ سے تاویل کی شاخیں پھوٹی ہیں۔ اس لئے پہلے اسی معمے کو حل کر لینا چاہیئے۔ وہ مشہور آیت جس میں یہ لفظ وارد ہوا ہے تمام کمال یوں ہے:۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُہٗ	اللہ (وہ ذات پاک ہے کہ) اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔
سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا	زندہ (کارخانۂ عالم کا) سنبھالنے والا۔ نہ اس کو اونگھ آتی
فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ	ہے اور نہ نیند۔ اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو
اِلَّا بِاِذْنِہٖ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ	کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو اس کے اذن کے بغیر اس
وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ	کی جناب میں (کسی کی) سفارش کرے۔ جو کچھ لوگوں کے
عِلْمِہٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ	پیش آرہا ہے (وہ) اور جو کچھ ان کے پیچھے ہو گزرا ہے
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا	(وہ) اس کو سب معلوم ہے اور لوگ اس کے معلومات
وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ۔	میں سے کسی چیز پر بھی حاوی نہیں مگر جتنے پر وہ چاہے اس

کی کرسی آسمان و زمین (سب) پر حاوی ہے۔ اور آسمان و زمین کی حفاظت اس پر (مطلق) گراں نہیں اور وہ

بڑا عالیشان ہے اور) اس کی بڑی بارگاہ ہے[1]۔

اس آیت میں اتنی باتیں مذکور ہیں۔

الف۔ اکیلا ایک خدا ہی معبود ہونے کے لائق ہے۔ اس لئے کہ شان معبودی صرف اسی کی ذات سے مخصوص ہے۔

ب۔ وہ زندہ ہے اور سارے جہان کے کام سنبھالے ہوئے ہے؛

ج۔ غفلت کا اس میں دخل تک نہیں۔ کام میں لگا ہوا ہے؛

د۔ ارادہ کا پکا ہے؛

ھ۔ اس کا علم نہایت وسیع ہے؛

و۔ آگے پیچھے سب کا اس کو علم ہے۔

ز۔ اس کا علم ایسا نہیں ہے کہ کوئی اپنی طاقت کے بل سے اس پر حاوی ہو جائے؛

ح۔ اس کی کرسی میں آسمان و زمین سب کی سمائی ہے؛

ط۔ آسمان و زمین کتنے ہی بھاری بھر کم ہوں لیکن خدا ان کی حفاظت سے نہیں تھکتا؛

ی۔ وہ بڑا برتر و بلند مرتبہ ہے؛

اس ترتیب پر غور کرو اور دیکھو کتنا اچھا تسلسل ہے:۔

لوگوں کو توجہ دلائی ہے کہ خدائے واحد کو معبود مانو۔ اس لئے کہ معبود ہونے کے لئے جتنے اوصاف ہو سکتے ہیں وہ اس کی ذات میں اور صرف اُسی کی ذات میں پائے جاتے ہیں۔

یہ اوصاف درجہ بدرجہ بیان کئے ہیں جن میں صفت علم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اور کئی طرح سے

---

[1] یہ ترجمہ مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ سے منقول ہے مولوی صاحب موصوف نے کرسی کے معنی ہیں التوسیع میں سلطنت کے بیان کئے ہیں "عظیم" کے معنی (بڑی بارگاہ) بتلاتے ہیں جو محض غلط ہیں۔ عظیم کے اصلی معنی تو صاحب عظمت کے ہیں۔

اس خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے ۔

اوصاف کی جو تدریجی رفتار قائم کی ہے اس کا اسلوب دیکھنے کے قابل ہے۔ ہر ایک صفت کا نچلا سرا اپنے بعد والی صفت کے اوپری حلقہ سے لگاؤ رکھتا ہے لیکن صفت (ح) کو (ط) سے تو لگاؤ ہے۔ مگر (ی) سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ علم کے ساتھ کرسی کو کیا مناسبت ہے؟

کرسی سے اگر بیٹھنے ہی کی کرسی مراد ہے اور وہ بھی اتنی بڑی کہ آسمان و زمین کو حاوی ہو تو جہاں یہ صفت بیان کی تھی کہ خدا آسمان و زمین کی حفاظت سے نہیں تھکتا۔ وہاں اسی ذیل میں کرسی کا تذکرہ کیوں نظر انداز کر دیا گیا۔ کرسی تو آسمان و زمین سب سے بڑی تھی۔ بڑی چیز کو چھوڑ کر چھوٹی چیز کے بار اٹھانے کے تذکرہ میں کیا بلاغت ہو سکتی ہے؟

(۴)

واقعہ یہ ہے کہ کلام عرب میں دراصل "کرسی" وہ ہے جس کا لوگ سہارا لیتے ہیں، زجاج کا قول ہے:۔ الذی تعرف من الکرسی فی اللغۃ الشیٔ الذی یعتمد علیہ (کرسی کے متعلق زبان میں جو معروف ہے وہ اسی قدر ہے کہ کرسی وہ ہے جس کا سہارا لیں) اسی لحاظ سے جس پر حکومت غالب تھی اور حکومت ہی کو سب سے بڑا سہارا مانتا تھا اس نے "کرسی" کے معنی حکومت قرار دیئے، جو بیٹھنے کی چیز کے سہارے پر قانع تھے وہ اس سے کرسی متعارف سمجھے، اور جن کی نظر خالص کلام عرب پر تھی ان کے نزدیک سب سے بڑا انسانی سہارا علم تھا اس لئے "کرسی" کے معنی علم کے ہو گئے، قدمائے اہل زبان میں علم کے لئے کرسی کا لفظ متداول تھا، کہتے تھے:۔

کرس الرجل۔ ای ازدحم علمہ علی قلبہ[1]۔

آؤ اس کے فیصلہ کے لئے سلف صالح کو حکم بنائیں۔

علامہ ابو جعفر ابن جریر طبری جن کی وفات کو ایک ہزار برس سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے[2] ہر ایک

---

[1] لسان العرب۔ ج ۸۔ ص ۷۷۔ [2] ابن جریر طبری نے سنہ ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔ ان کی تفسیر کی نسبت علامہ ابو حامد اسفرائنی

باقی بر صفحہ ۱۰۶

بات میں روایت کے پابند ہیں اور گو ان کا خاص ذوق یہ ہے کہ حدیث کے نام سے چاہے کیسی ہی بات کہی جائے وہ سب کی روایت کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، تاہم بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر ایک بات کے متعلق مختلف انداز کی روایتیں جمع کر دیتے ہیں جن سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ صحابہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فلاں آیت کا کیا مطلب سمجھتے تھے اور ان کی اس بات میں کیا رائے تھی۔ اس آیت کی تفسیر میں بھی حسب معمول متعدد روایتیں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

اما الذی یدل علی صحته ظاهر القرآن فقول ابن عباس الذی رواه جعفر بن ابی مغیرة عن سعید بن جبیر عنه انه قال: ھو ای الکرسی) علمه" وکذالک لدلالة قوله تعالیٰ ذکره: "ولا یؤده حفظهما" علی ان ذٰلک کذالک فاخبر انه لا یؤده حفظ ما علم و احاط به مما فی السمٰوٰت والارض وکما اخبر عن ملائکته انهم قالوا فی دعائهم: "ربنا وسعت کل شیٔ رحمة وعلما" فاخبر تعالیٰ ذکره

لیکن وہ بات جس کے صحیح ہونے پر کھلم کھلا قرآن دلالت کر رہا ہے تو وہ ابن عباس کا قول ہے جسے جعفر بن مغیرہ نے سعید بن جبیر کے حوالے سے بیان کیا کہ ابن عباس کہتے تھے کہ "آیۃ الکرسی میں" کرسی سے مراد خدا کا علم ہے" ابن عباس نے یہ بات اس لئے کہی کہ آیت "آسمان و زمین کی نگہبانی خدا کو نہیں تھکاتی" خود اس پر دلیل ہے۔ خدا نے اطلاع دی ہے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے خدا کو سب کا علم ہے اور سب پر وہ محیط ہے۔ ان میں سے کسی کی حفاظت اس کو تھکا نہیں سکتی۔ اسی طرح اپنے فرشتوں کے متعلق خبر دی ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں "اے ہمارے پروردگار تیری رحمت اور تیرا علم ہر ایک چیز کو وسیع ہے" اس مذکور سے یہ آگاہ کرنا مقصود تھا کہ

(بقیہ صفحہ ۱۰۵) کی رائے ہے کہ لو سافر رجل الی الصین حتی یحصل له کتاب تفسیر محمد بن جریر لم یکن ذٰلک کثیرا۔ (تفسیر ابن جریر کے لینے کے لئے اگر کوئی شخص چین تک چلا جائے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی ملاحظہ ہو طبقات الشافعیہ لابن السبکی۔ ۱۳۲۱ھ میں یہ تفسیر مصر کے مطبع میمنیہ میں چھپ گئی ہے۔)

ان علمه وسع كل شئ فكذلك قوله "وسع كرسيه السمٰوٰت والارض" واصل الكرسي العلم ومنه قيل للصحيفة يكون فيها علم مكتوب كراسة ومنه قول الراجز فے صفة قانص:-

"حتى اذا ما اختارها تكرسا"

يعني علم - ومنه يقال للعلماء الكراسي لانهم المعتمد عليهم كما يقال اوتاد الارض يعني بذلك انهم العلماء الذين تصلح بهم الارض ومنه قول الشاعر -

تحف بهم بيض الوجوه وعصبة
كراسي بالاحداث حين تنوب

يعني بذلك علماء بحوادث الامور ونوازلها۔ [1]

خدا کا علم ہر چیز کو حاوی ہے لہذا اسی طرح آیت اس کی کرسی آسمان وزمین کو حاوی ہے" میں کرسی سے مراد علم ہی ہے یعنی خدا کا علم آسمان وزمین میں جو کچھ ہے سب کو حاوی ہے" کرسی کے اصلی معنی بھی علم ہی کے ہیں۔ کراسہ اسی لفظ سے نکلا ہے۔ جس کے معنی جزو کتاب کے ہیں جس میں علمی باتیں لکھی ہوتی ہیں۔ راجز شاعر نے اسی بنا پر ایک شکاری کی صفت میں کہا تھا۔

"حتی اذا ما اختارها تکرسا"

اس میں تکرس سے" علم ہی مراد ہے۔ علما کو بھی اسی لئے کرسی کہتے ہیں۔ کیونکہ انہیں پر اعتماد ہوا کرتا ہے۔ انہیں "اوتاد الارض" زمین کی میخ بھی کہا جاتا ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ ان علما میں ہیں جن کی بدولت زمین سنبھلی ہوئی ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے:-

تحف بهم بيض الوجوه وعصبة
كراسي بالاحداث حين تنوب

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے کرسی یعنی عالم ہیں جن کو حادثوں اور مصیبتوں کی خبر رہا کرتی ہے۔

قدیم بزرگان اہل تشیع کو بھی اس معنے سے اتفاق ہے اور ائمہ اثنا عشر میں دو امام ابوجعفر و ابوعبداللہ رضی اللہ عنہما سے یہی مطلب ماثور ہے۔ اس فرقے کے سب سے بڑے مفسر علامہ طبرسی ہیں جن کی کتاب

[1] تفسیر ابن جریر ج ۳۔ ص ۷ و ۸۔

مجمع البیان میرے سامنے ہے وسع کرسیہ کی چار تاویلیں کی ہیں جن میں پہلا نمبر یہ ہے کہ کرسی کے معنی علم ہیں

وسع علمہ السمٰوٰت والارض عن ابن عباس و مجاھد وھو المروی عن ابی جعفر وابی عبد اللہ۔[1]	ابن عباس اور مجاہد کی روایت میں کرسی سے علم مراد ہے۔ امام ابو جعفر اور امام ابو عبد اللہ سے بھی یہی معنی مروی ہیں۔

اسمٰعیلی بھی اسی معنی کے قائل ہیں "مجالس مویدیہ" کی ایک مجلس اسی کے لئے مخصوص ہے صوفیہ بھی اسی جانب مایل ہیں، شیخ اکبر محی الدین بن عربی صاحب فصوص و فتوح اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

وسع کرسیہ السمٰوٰت والارض ای علمہ اذ الکرسی مکان العلم الذی ھو القلب کما قال ابو یزید البسطامی رحمۃ اللہ علیہ "لو وقع العالم و ما فیہ الف الف مرۃ فی زاویۃ من زوایا قلب العارف ما احس بہ لغایتہ سعتہ"[2]	"وسع کرسیہ" میں کرسی سے مراد اللہ کا علم ہے۔ کرسی محل علم ہے اور اسی کا نام قلب ہے ابو یزید بسطامی فرماتے ہیں کہ" عارف کے کسی ایک گوشہ قلب میں اگر تمام جہان مع اپنے تمام موجودات کے ایک ہی مرتبہ نہیں بلکہ ہزار ہزار مرتبہ جا پڑے تو کمال وسعت قلب کے باعث عارف کو یہ محسوس تک نہ ہوا۔

اس تصریح نے تمام عقدے حل کر دیئے اور بتا دیا کہ جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے اس میں کرسی کا مفہوم کیا تھا اور کن مطالب کے لئے اس لفظ کا استعمال کیا جاتا تھا۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان۔ جلد ۱ صفحہ ۱۴۸۔

[2] تفسیر ابن عربی۔ صفحہ ۸۹۔

گوسالہ سامری

(از مولینا عبداللہ العمادی)

ای برہمن آں عذار چوں لالہ پرست　　رخسار نگار چار دہ سالہ پرست
گر چشم خدائے بین نداری بارے　　خورشید پرست شو نہ گوسالہ پرست

(۱)

ایک سامری وہ تھے جن کے آثار تمدن آج کل سندھ کے حفریات سے نمایاں ہو رہے ہیں، اصطلاحی معنی میں یہ سامی قوم اگر عرب نہ تھی تو کوئی شک نہیں کہ عربی قومیت کے خاندان سے قریب تریں تعلق رکھتی تھی، حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے کئی ہزار برس قبل سامریوں نے عراق سے نکل کر ہندوستان کا رخ کیا اور سندھ میں ایک ایسے تمدن کی طرح ڈالی جس کے خط و خال کی نمو داریوں نے آج ایک عالم کو محو حیرت بنا رکھا ہے۔ بلوچستان اور ملیبار میں اس قوم کی یاد اب بھی تازہ ہے۔ اور اگرچہ اس قدیم تہذیب کا نشان معدوم ہو چکا ہے مگر نام اب بھی موجود ہے۔

لیکن آج کے مضمون سے یہ سامری متعلق نہیں۔

آج کا مضمون اس سامری سے متعلق ہے جس نے ایک گوسالہ بنایا تھا۔ اور بہتیرے یہودیوں سے اس کی پوجا کرائی تھی عجب نہیں یہ بھی اسی قوم کا لقیہ ہو۔

اس گوسالہ پر ایک عجیب افسانے کا رنگ چڑھایا گیا ہے اور اس رنگ سازی میں کلام اللہ کو لایا گیا ہے، ایسی رنگینی پیدا کرنے والے دماغوں سے گوسالہ آرائی پر بحث کی ضرورت نہیں۔

ضرورت صرف اس قدر ہے کہ گوسالہ آرائی کی ذہن میں آیات کلام اللہ کے متعلق جو غلط ملط کیا گیا ہے اس کو صاف کر دیا جائے۔

اس باب میں اہل نظر کے نقل اقوال پر ہی میں نے قناعت کی ہے، خود میری کوئی رائے نہیں، اور خدا نہ کرے کہ میں کلام اللہ کے مفہوم متعین کرنے میں اپنی رائے کو دخل دوں۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا ہوں گو قدم راہبر کو میں

سامری کے گوسالہ کا تذکرہ تو کئی جگہ ہے لیکن گوسالہ میں آواز پیدا ہونے کے سبب کا تذکرہ بیان کیا جاتا ہے کہ سورۂ طٰہٰ میں ہے آیات ذیل ملاحظہ ہو۔

وَمَا أَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يَمُوسَى ○	اور (جب موسیٰ تورات لینے آگے بڑھ آئے تو ہم نے پوچھا کہ
قَالَ هُمْ أُولَاءِ عَلَى أَثَرِي وَعَجِلْتُ	اے موسیٰ تم جاری کر کے اپنی قوم سے کیسے آگے آ گئے عرض کیا
إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَى ○ قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا	وہ بھی یہ میرے پیچھے لہی پیچھے چلے آ رہے ہیں۔) اور اے
قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ○	میرے پروردگار میں جلدی کر کے تیری طرف اس لئے بڑھ
فَرَجَعَ مُوسَى إِلَى قَوْمِهِ غَضْبَانَ	آیا ہوں کہ تو (مجھ سے) خوش ہو فرمایا کہ ہم نے تمہارے
أَسِفًا ۚ قَالَ يَقَوْمِ أَلَمْ يَعِدْكُمْ	پیچھے تمہاری قوم کو (ایک اور) بلا میں مبتلا کر دیا ہے
رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ	اور (وہ یہ ہے کہ) ان کو سامری نے گمراہ کیا، پھر موسیٰ
الْعَهْدُ أَمْ أَرَدْتُمْ أَنْ يَحِلَّ عَلَيْكُمْ	غصے اور افسوس کی حالت میں اپنی قوم کی طرف واپس
غَضَبٌ مِنْ رَبِّكُمْ فَأَخْلَفْتُمْ مَوْعِدِي ○	آئے اور آ کر کہنے لگے کہ بھائیو! کیا تم سے تمہارے
قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلَكِنَّا	پروردگار نے عمدہ (کتاب یعنی تورات کے دینے کا)
حُمِّلْنَا أَوْزَارًا مِنْ زِينَةِ الْقَوْمِ	وعدہ نہیں کیا تھا تو کیا تم کو (اس وعدے کی) مدت

فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ۙ
فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ
فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۥ
فَنَسِيَ ۭ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ
قَوْلًا ۥ وَّلَا يَمْلِكُ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۧ
وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ
يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ
رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا
اَمْرِيْ ۝ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ
حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۝ قَالَ يٰهٰرُوْنُ
مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۙ اَلَّا
تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۝ قَالَ
يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ
اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ
بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ
قَوْلِيْ ۝ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ
قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ
فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ
فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ۔

بڑی لاابالی معلوم ہوئی اور اس وجہ سے تم نے اس عہد کے خلاف
کیا جو (خدائے واحد کی پرستش کا) مجھ سے کر چکے تھے (وہ)
لگے کہنے کہ ہم نے اپنے اختیار سے تمہارے ساتھ عہد شکنی
نہیں کی (ہم کو یہ معاملہ پیش آیا کہ قبطیوں کی) قوم کے
زیوروں کا بوجھ جو (مصر سے چلتے وقت) ہم پر لاد دیا
گیا تھا اب (سامری کے کہنے سے) ہم نے اس کو (آگ
میں) ڈال دیا۔ اور اسی طرح سامری نے بھی (اپنے پاس کا
زیور) ڈالا پھر سامری ہی نے (لوگوں کے لئے اس کا
ایک) بچھڑا (بنا کر) نکال کھڑا کیا (یعنی بچھڑا بنایا) بت
جس کی آواز (بھی) بچھڑے کی سی تھی۔ اس پر بعض
لوگ کہنے لگے کہ یہی تو تمہارا معبود ہے اور موسیٰ کا معبود
(بھی یہی تھا) اور وہ بھول (کر کوہ طور پر چلا گیا ہے۔ کیا ان
لوگوں کو اتنی بات بھی نہیں سوجھ پڑتی تھی۔ کہ (بچھڑا)
ان کی بات کا نہ تو الٹ کر جواب دے سکتا ہے اور نہ
ان کے کسی نقصان کا مالک ہے اور نہ کسی نفع کا۔ اور
ہارون نے (بچھڑے کی پرستش سے) پہلے ان سے کہا
بھی کہ بھائیو! یہ تو اس (بچھڑے) کے ذریعے سے تمہاری
آزمائش کی جا رہی ہے۔ ورنہ تمہارا پروردگار تو (خدائے)
رحمٰن ہے تم میرے کہے پر چلو اور میری بات مانو (وہ) لگے کہنے

قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ وَانْظُرْ اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا اِنَّمَا اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا

(سورہ ۲۰۔ رکوع ۳ و ۴۔ آیت ۹۲ تا ۹۸)

کہ جب تک موسیٰ لوٹ کر ہمارے پاس (نہ) آئیں ہم (تو) برابر اسی (بچھڑے) کی پرستش) پر جمے بیٹھے رہیں گے۔ (موسیٰ نے ہارون کی طرف خطاب کرکے) کہا کہ ہارون! جب تم نے ان کو دیکھا تھا (کہ یہ لوگ) گمراہ ہو گئے تو تم کو کیا وجہ مانع ہوئی کہ تم نے میری ہدایت کی پیروی نہ کی۔ کیا تم نے میری عدول حکمی کی (وہ) بولے کہ اے میرے ماں جائے (بھائی) میری ڈاڑھی اور سر (کے بال) نہ پکڑو (میں اس بات) سے ڈرا کہ (تم واپس آکر) کہیں یہ (نہ) کہنے لگو کہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔ (اب موسیٰ نے سامری سے) پوچھا کہ سامری! تیرا کیا حال ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے وہ چیز دکھائی دی (جبرئیل کو دیکھا کہ وہ گھوڑے پر سوار چلے جا رہے ہیں) تو میں نے جبرئیل فرشتے (کی گھوڑی کے نقش قدم (کی مٹی) سے ایک مٹھی بھر لی پھر اس کو ڈھلے ہوئے بچھڑے میں ڈالدیا (اور وہ بھائیں بھائیں کرنے لگا) اور (اس وقت) میرے دل نے مجھکو ایسی ہی صلاح دی! موسیٰ نے کہا چل (دور ہو) اس زندگی میں تو تیری یہ سزا ہے کہ (زندگی بھر) کہتا پڑا پھر کہ (دیکھو مجھے کوئی) چھو نہ جانا (ورنہ ہم دونوں کو تپ آجائے گی) اور (اس کے علاوہ) تیرے لئے (عذاب قیامت کا) ایک وعدہ اور بھی ہے جو کسی طرح تجھ پر سے ٹلے گا نہیں اور اپنے (اس) معبود (یعنی بچھڑے) کی طرف دیکھ جس (کی پرستش) پر تو جما بیٹھا تھا اس کو ہم جلا کر (راکھ کر) دیں گے۔ پھر اس (راکھ کو دریا میں بکھیر کر بہا دیں گے۔ لوگو تمہارا (اصل) معبود بس اللہ ہے جس کے سوا کوئی (اور) معبود نہیں (اور) اس کا علم سب چیزوں پر حاوی ہے!

حسب معمول اِن آیات کا ترجمہ بھی شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم سے ماخوذ ہے یہودیوں میں اس قصّے کے متعلق بہت سی دور از کار روایتیں مشہور تھیں جو مفسرین کی عنایت سے مسلمانوں میں اب تک مشہور چلی آتی ہیں اور ہمارے شمس العلماء نے تو بطور ایک واقعۂ مسلّمہ کے آیات کا ترجمہ بھی اسی انداز میں کیا ہے اس ترجمہ کی بنا پر قرآن کریم کو متعدد دھکے برداشت کرنا پڑتے ہیں۔

(الف) جبرئیل کی گھوڑی کے نقش قدم کی مٹی سامری کو کیونکر ملی؟

(ب) کیا آسمانی فرشتے گھوڑوں پر سوار ہو کر زمین کی سیر کیا کرتے ہیں۔؟

(ج) کیا ان گھوڑوں کے نقش قدم کی مٹی کو ڈھلے ہوئے مجسمے کے جوف میں ڈالنے سے اس کا زندہ جانور ہو جانا ممکن ہے؟

(د) سامریین کا فرقہ تو حضرت موسیٰؑ کے زمانے سے تعلق نہیں رکھتا پھر یہ سامری اس زمانہ میں کہاں سے نکل آیا؟

(ھ) تورات تو کہتی ہے کہ حضرت ہارون نے بچھڑا بنایا تھا پھر اس واضح تصریح کے ساتھ کلام اللہ کا کھلا ہوا اختلاف کیا معنے رکھتا ہے۔؟

ہمارے دوست شیخ عبد القادر مغربی نے جو طرابلس الشام کے محقق ہیں۔ ان شبہات کی تادیل کی ہے اگر ان کو چوتھے اور پانچویں شبہہ کے متعلق غور کرنے کا موقع نہیں ملا، پہلے دوسرے اور تیسرے اعتراضات میں جبرئیل کی گھوڑی کا واقعہ اور اس کے نقش قدم کی مٹی کے ذریعہ سے ڈھلے ہوئے بچھڑے میں جان کا آجانا یہ دونوں باتیں ان کی رائے میں قرآن سے مستنبط ہو رہی ہیں۔ لیکن اعتراضات کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ:۔

۱۔ قرآن نے سامری کے قول کو نقل کیا ہے۔ ممکن ہے اسی نے جھوٹ کہا ہو لیکن اس سے قرآن پر حرف نہیں آسکتا؛

۲۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ بچھڑے کا مجسمہ زندہ ہو گیا تھا، وہ صرف آواز کا تذکرہ کر رہا ہے جو عجیب نہیں کہ کسی کل کے ذریعہ سے سامری نے پیدا کر لی ہو۔

سید احمد خاں کی رائے میں "ایک لفظ بھی قرآن مجید کا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ اس بچھڑے میں سچ مچ کی اللہ خدا کے پیدا کئے ہوئے بچھڑے کے مانند آواز تھی۔ بلکہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سامری نے اس بچھڑے کو اس طرح بنایا تھا کہ اس میں سے آواز بھی نکلتی تھی۔ ہزاروں جانور اب بھی کاریگر اس طرح سے بناتے ہیں کہ وہ اڑتے ہیں۔ ہلتے ہیں۔ حرکت کرتے ہیں بولتے ہیں۔ سامری نے بھی اس بچھڑے کو ایسی کاریگری سے بنایا تھا کہ اس میں سے آواز بھی نکلتی تھی"[1]

یہ مضمون قابل اعتنا ہے لیکن مرحوم نے اس کے ساتھ جبرئیل کی گھوڑی کے نقش قدم کی مٹی لے کر بچھڑے کے جوف میں ڈالنے کے واقعہ سے تو بڑی سختی سے انکار کیا ہے، مگر وہ یہ جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ جب پہاڑ کو جا رہے تھے تو سامری نے ان کے نقش قدم کی مٹھی بھر مٹی اٹھا لی تھی اور بعد کو وہی مٹی بچھڑے کے جوف میں ڈالی تھی[2]

—— (۲) ——

کلام اللہ کے الفاظ بہت ہی واضح اور صاف صاف ہیں۔ ان میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہ اس کا ترجمہ جبریل فرشتہ۔ یا فرشتہ کی گھوڑی۔ یا مٹی کر سکتے ہوں ابو مسلم کی رائے میں حضرت موسیٰؑ نے جب سامری کو ملامت کی تو اس نے انہیں مخاطب کر کے کہا کہ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَٰلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي (مجھے ایسی بات سوجھی جو کسی کو نہ سوجھی تھی اے رسول (موسیٰ) میں پہلے تمہاری پیروی کرتا تھا لیکن اب میں نے چھوڑ دی اور میرے جی میں ایسا ہی آیا) عربی محاورہ میں پیروی کے لئے قبض اثر کا استعمال عام طور پر رائج ہے۔ اور شعرائے جاہلیت کے

[1] تفسیر القرآن جلد ۳ صفحہ ۱۹۸ (طبع لاہور)
[2] تفسیر القرآن صفحہ ۱۹۷

کلام سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ھٰذا اما عندھم، امّا الذی عندی فاسبح اللّٰہ کثیرا واذکرہ کثیرا لیطمئن قلبی الا بذکراللّٰہ تطمئن القلوب۔

ابومسلم اصفہانی لکھتے ہیں:۔

لیس فی القرآن تصریح بھذا الذی ذکرہ المفسرون[1] فھھنا وجہٌ اٰخر وھوان یکون المراد بالرسول موسیٰ علیہ السلام وباثرہ سنتہ ورسمہ الذی امربہ فقد یقول الرجل فلان یقفو اثر فلان ویقبض اثرہٗ اذا کان	مفسرین جو بیان کرتے ہیں قرآن میں اس کی کوئی تصریح موجود نہیں ہے۔ یہاں ایک دوسری بات ہے اور وہ یہ ہے کہ لفظ رسول سے حضرت موسیٰؑ مراد ہیں اور اثر الرسول سے ان کی سنت طریقہ مراد ہے جس کی پابندی کا انہوں نے حکم دیا تھا جب کوئی کسی کے طریقے پر کاربند ہوا کرتا ہے تو کہتے ہیں "فلان یقفوا اثر فلان ویقبض اثرہ" یا فلان یقبض اثر فلان"

[1] مفسرین یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ جب بنی اسرائیل کی تمام جماعت لے کر مصر سے شبا شب نکل آئے تو فرعون نے لشکر لے کر ان کا پیچھا کیا۔ جاتے جاتے بنی اسرائیل جب دریا کے کنارے پہنچے تو حضرت موسیٰؑ کے معجزہ سے وہ پایاب ہوگیا۔ اور سب لوگ پار اتر گئے فرعون یہ دیکھکر کچھ ٹھٹک سا گیا لیکن خدا کو اس کا غرق کرنا منظور تھا۔ حضرت جبرئیل ایک انسان کے بھیس میں گھوڑے پر سوار آنکلے۔ فرعون کے گھوڑے کے آگے اپنی گھوڑی کردی اور دریا میں اتر گئے فرعون کا گھوڑا یہ دیکھکر شوخی کرنے لگا اور فرعون کو لے کر بے ساختہ گھوڑی کے پیچھے دریا میں اتر گیا مصریوں نے جب اپنے بادشاہ کو دریا میں اترتے دیکھا تو سب لوگ اس کے پیچھے ہولئے اور بیچ دھار میں جاکر یک لخت سب ڈوب گئے۔ سامری کی پرورش حضرت جبرئیل نے کی تھی لہذا وہ انہیں خوب پہچانتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ حضرت جبرئیل گھوڑی پر سوار جا رہے ہیں تو گھوڑی کے نقش قدم کی ایک مٹھی بھر مٹی اٹھالی اور جب حضرت موسیٰؑ تورات لینے کے لئے کوہ طور پر گئے تو سونے چاندی کے زیور جو مصر سے باہر نکلنے کے قبل بنی اسرائیل کی عورتیں قبطیوں سے مستعار لے کر بھاگ آئی تھیں سامری نے ان سب کو اکٹھا کیا اور تمام زیوروں کو گلا کر ایک بچھڑا بنایا اور اس کے جوف میں وہی مٹی جو حضرت جبرئیل کی گھوڑی کے نقش قدم سے اس نے اٹھائی تھی ڈالدی جس کی وجہ سے بچھڑا زندہ ہوگیا۔ اور بولنے لگا۔ اسی طرح کی بہت سی باتیں عرب کے یہودیوں میں مشہور تھیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ افسانے اس طرح سے قرآن کریم میں کہیں بھی مذکور نہیں۔

يمتثل رسمه والتقدير ان موسىٰ
عليه السلام لما اقبل على السامري
باللوم والمسألة عن الامر الذي
دعاه الى اضلال القوم في باب
العجل فقال بصرت بما لم يبصروا
به اي عرفت ان الذي انتم عليه
ليس بحق وقد كنت قبضت قبضة
من اثرك ايها الرسول اي شيئًا
من سنتك ودينك فنبذتها اي
طرحتها فعند ذلك اعلمه موسىٰ
عليه السلام بما له من العذاب
في الدنيا والاخرة انما اورد
بلفظ الاخبار عن غائب كما
يقول الرجل لرئيسه وهو مواجهٌ
له ما يقول الامير في كذا وبماذا يأمر
الامير واما دعاؤه موسى عليه السلام
رسولا مع جحده وكفره فعلى مثل مذهب
من حكى الله تعالىٰ عنه قوله يا ايها الذي
نزل عليه الذكر انك لمجنون وان لم

یعنی اس کی روش کی پیروی کرتا ہے) مطلب یہ ہے کہ حضرت
موسیٰ جب سامری کو ملامت کرنے لگے اور پوچھا کہ کیا بات تھی
کہ گوسالہ کے ذریعہ سے لوگوں کو گمراہ کر ڈالا تو اس نے جواب دیا
کہ مجھے وہ سوجھی جو تم میں سے کسی کو نہ سوجھی" یعنی مجھے معلوم
ہو گیا کہ جس طریقہ پر تم ہو وہ درست نہیں ہے" اے پیغمبر پہلے میں نے
تمہارے اثر کو کچھ قبضہ میں کر لیا تھا" یعنی تمہارے طریقہ و مذہب
کا کچھ پابند تھا" بعد کو میں نے اسے چھوڑ دیا" یہ سن کر حضرت
موسیٰ نے اس کو بتایا کہ اس کا کیا نتیجہ ہونے والا ہے اور
دنیا و آخرت میں اس کو کیا کیا عذاب ہوں گے سامری نے
رسول کہکر حضرت موسیٰ سے اس طرح باتیں کی تھیں جیسے
کسی غائب کا تذکرہ ہو رہا ہو اس کی مثال ایسی ہی ہے
جیسے کسی بڑے آدمی سے کوئی اس کے روبرو کہے کہ "اس
امر میں امیر کا کیا حکم ہے" یا فلاں مسئلہ میں بادشاہ سلامت
کیا فرماتے ہیں" رہی یہ بات کہ سامری تو منکر تھا۔ پھر اس
نے حضرت موسیٰ کو رسول کیوں کہا۔ تو اس کی مثال یوں
سمجھنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی نسبت کافروں
کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اے وہ شخص کہ اس پر وحی اتری
ہے تو مجنون ہے" حال آنکہ ان کافروں میں کوئی بھی
پیغمبر پر وحی اترنے کا۔

یؤمنوا بالانزال ۔ [1]	قائل نہ تھا ۔ [1]

امام رازی نے اس مضمون کو حرف بحرف نقل کیا ہے ۔ اور پھر فرماتے ہیں :۔

واعلم ان ھٰذا القول الذی ذکرہ	واضح ہو کہ یہ قول جو ابومسلم نے بیان کیا ہے اس میں مفسرین
ابومسلم لیس فیہ الا مخالفۃ	کے اقوال کی مخالفت تو ہے لیکن یہ قول تحقیق کے بہت
المفسرین ولکنہ اقرب الی التحقیق	قریب ہے ۔ اس کی کئی وجہیں ہیں ۔
لوجوہ احدھا ان جبرئیل علیہ	پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت جبرئیل رسول کے نام سے
السلام لیس بمشھور باسم الرّسول	مشہور نہ تھے اور نہ پہلے کہیں ان کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ الف
ولم یجرلہ فیما تقدم ذکرٌ حتی یجعل	ولام تعریف ان کے نام (رسول) پر آتا اور اس سے جبرئیل
اللام التعریف اشارۃ الیہ فاطلاق	مراد ہوتے ۔ رسول کہنا اور جبرئیل مراد لینا یہ تو گویا علم
لفظ الرسول لارادۃ جبرئیل علیہ	غیب کی تکلیف دینا ہے ۔
السلام کانہ تکلیف بعلم الغیب ۔	دوسرے یہ کہ اس صورت میں ضمیر لانے کی ضرورت ہوگی ۔
وثانیھا انہ لابدّ فیہ من الاضمار	یعنی رسول کے گھوڑے کے سم کا نقش ۔ اور یہ ظاہر ہے
وھو قبضۃ من اثر حافر فرس	کہ ضمیر خلاف اصل ہے ؛
الرسول ۔ والاضمار خلاف الاصل ۔	تیسری مشکل یہ ہے کہ اس توجیہ میں ضرور تکلف کرنا پڑے
وثالثھا انہ لابدّ من التعسف	گا ۔ کہ تمام لوگوں میں اکیلے ایک سامری ہی نے مخصوص
فی بیان ان السامری کیف اختص	طور پر کیسے جبرئیل کو دیکھا اور انہیں پہچان بھی لیا ۔ پھر
من بین جمیع الناس برویۃ جبرئیل	اسے کیونکر معلوم ہوا کہ حضرت جبرئیل کی گھوڑی کے سم
علیہ السلام ومعرفتہ؟ ثم کیف	کی مٹی میں یہ اثر ہے ۔ مفسرین یہ جو توجیہ کرتے ہیں کہ
عرف ان التراب حافر فرسہ ھٰذا	حضرت جبرئیل ہی نے سامری کو پالا تھا ۔ تو یہ اور

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۶ صفحہ ۶۸ و ۹۶ طبع خیریہ مصر ۱۳۰۸ھ

الاثر و ان الذی ذکرہ من ان جبرئیل علیہ السلام ھو الذی رباہ فبعید لان السامری ان عرف جبرئیل حال کمال عقلہ عرف قطعًا ان موسیٰ علیہ السلام نبیٌ صادقٌ فکیف یحاول الاضلال - وان کان ما عرفہ حال البلوغ فأی منفعۃ لکون جبرئیل علیہ السلام مربیًا لہ حال الطفولیۃ فی حصول تلک المعرفۃ۔

بھی دور کی بات ہے اس لئے کہ سامری کو جب پوری عقل آچکی تھی اس زمانے میں اگر جبرئیل کو پہچانتے ہوتا تو یقیناً اس کو یہ بھی معلوم ہوا ہوتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سچے پیغمبر ہیں اس صورت میں وہ گمراہ کرنے کا کیوں کر قصد کر سکتا تھا۔ اور اگر اس نے بلوغ کے زمانے میں حضرت جبرئیل کو نہیں پہچانا تھا تو اگر جبرئیل لڑکپن میں اس کے مربی رہے بھی تو اس سے کیا فائدہ ہوا۔ اور یہ سابقہ معرفت کس طرح کام آسکتی تھی۔

ورابعها انہ لو جاز اطلاع بعض الکفرۃ علی تراب ھذا شانہ فلقائل ان یقول۔ فلعل موسیٰ علیہ السلام اطلع علی شیٔ آخر یشبہ ذلک فلاجلہ اتی بالمعجزات" ویرجع حاصلہ الی سوال من یطعن فی المعجزات ویقول" لم لایجوز ان یقال انھم لاختصاصھم بعض الادویۃ التی لھا خاصیۃ

چوتھی دقت یہ ہے کہ اگر یہ جائز ہے کہ ایسی تاثیر کی مٹی سے کفار واقف ہو سکتے ہیں، تو اعتراض کرنے والے کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ عجب نہیں حضرت موسیٰ نے بھی اسی تاثیر کی کوئی اور چیز پالی ہو اور اسی کے اثر سے یہ معجزات صادر ہوئے ہوں نتیجہ یہ ہوگا کہ معجزات میں طعن کرنے کی ایک اور سبیل نکل آئے گی اور معترض کہے گا کہ یہ کہنا کیونکر ناجائز ہو سکتا ہے کہ پیغمبروں کو بعض ایسی دوائیں مل گئی ہوں جن کی خاصیت سے اس طرح کے معجزات صادر ہو سکتے ہوں۔ غرض کہ یہ وہ صورت ہے

ان تفید حصول تلك المعجزة اتو ابتلك المعجزة؛ وحینئذٍ ینسد باب المعجزات بالکلیه	کہ اس افسانہ کو اگر صحیح مانا جائے تو معجزات کا دروازہ بالکل بند ہو جاتا ہے۔
اما قوله- وکذٰلك سوّلت لی نفسی" فالمعنی فعلت ما دعتنی الیه نفسی- وسوّلت ماخوذ من السوال فالمعنی لم یدعنی الی ما فعلته احد غیری بل اتبعت هوای فیه[۱]	سامری کا یہ کہنا کہ وَکَذٰلِكَ سولت لی نفسی- ایسا ہی میرے جی میں آیا) اس کا یہ مطلب ہے کہ میرے نفس نے جو تحریک کی اسی پر میں کاربند ہوا۔ لفظ۔ سوّلت ، سوال سے ماخوذ ہے ۔ اسی کے معنی یہ ہوئے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے کسی دوسرے شخص نے مجھے اس جانب تحریک نہیں کی تھی بلکہ اس باب میں محض اپنی خواہش نفسانی کی میں نے پیروی کی۔[۱]

(۴)

یہ سچ ہے کہ قوم سامرین کا زمانہ حضرت موسیٰؑ کے ہم عہد نہیں لیکن کیا ایک نام کا ایک ہی شخص ہوا کرتا ہے ؟ تورات میں سامر کا نام کئی جگہ آیا ہے[۲]۔ ممکن ہے تغیّر لہجہ سے عبری کا سامر عربی میں سامری بن گیا ہو۔ لیکن اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ سامری قوم سامرہ ہی کا ایک فرد تھا جب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ سید احمد خاں لکھتے ہیں۔

"بنی اسرائیل کے بارہ سبط تھے اور سب ایک سلطنت کے ماتحت تھے ۔ مگر جب رحبعام بادشاہ ہوا تو بنی اسرائیل کے دس سبط نے اس سے بغاوت کی اور یاربعام پسر نباط کو اپنا بادشاہ بنایا۔ اس نے اپنے ملک میں بمقام بیت ایل اور دان کے سونے کے بچھڑے بنائے (دیکھو اول سلاطین باب ۱۲۔ آیت ۲۸ و ۲۹) اور

---

[۱] تفسیر جلد ۶ صفحہ ۶۹۔

[۲] اخبار الایام (اول تاریخ) باب ۷، آیت ۳۴ و باب ۸۔ آیت ۱۲۔

ان کی پرستش شروع کی۔ جب کہ عمری ان لوگوں پر بادشاہ ہوا تو اس نے کوہ شومون کو اس کے مالک سے جس کا نام شمر تھا خرید لیا۔ (سلاطین میں بجائے شمر کے سامر لکھا ہے) اور وہاں شہر بنایا جو دارالخلافتہ ہوگیا دیکھو اول سلاطین۔ باب ۱۶۔ آیت ۲۳ لغایتہ ۲۵) اور اسی سبب سے وہ لوگ سارتن یا شامری یا سامری مشہور ہوئے۔ وہ قوم جس میں کے شخص نے بنی اسرائیل کے لئے بچھڑا بنایا تھا قرآن مجید کے بہت پہلے سے سامری کے نام سے کہلاتی تھی قرآن مجید میں السامری کہنے سے صرف یہ اشارہ ہے کہ اس کا بنانے والا اس قوم میں سے تھا جنہوں نے آخر کار یار بعام کی اطاعت کر کے سونے کے بچھڑوں کی پرستش کی تھی اور جو لوگ سامری یعنی سمارتن کے لقب سے مشہور ہیں۔[۵]

---(۵)---

اس واقعے کے متعلق توراۃ کا بیان حسب ذیل ہے :۔

جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ پہاڑ سے اترنے میں دیر کرتا ہے تو وہ ہارون کے پاس جمع ہوئے اور اُسے کہا کہ اُٹھ ہمارے لئے معبود بنا کہ ہمارے آگے چلیں کیونکہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا۔ ہارون نے کہا کہ سونے کے زیور جو تمہاری بیویوں بیٹیوں اور بیٹوں کے کانوں میں ہیں اُتار اُتار کے میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ سب لوگ زیوروں کو جو ان کے پاس تھے اُتار اُتار کے ہارون کے پاس لائے۔ اس نے ان کو ہاتھوں سے لیا۔ اور ایک بچھڑا ڈھال کر اس کی صورت حکاکی کے اوزار سے درست کی۔ انہوں نے کہا کہ اے بنی اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر سے نکال لایا جب ہارون نے یہ دیکھا تو اُس کے آگے ایک قربانگاہ بنائی۔ ہارون نے یہ کہہ کر منادی کی کہ کل خداوند کے لئے عید ہے۔ وہ صبح کو اٹھے اور سوختنی قربانیاں چڑھائیں۔ سلامتی کی قربانیاں گزرانیں لوگ کھانے پینے کو بیٹھے اور کھیلنے کو اٹھے۔ تب خداوند نے موسیٰ کو کہا کہ اتر جا کیونکہ تیرے لوگ جنہیں تو مصر کے ملک سے چھڑا لایا خراب ہوگئے ہیں۔ وہ اس راہ سے جو میں نے انہیں فرمائی جلد پھر گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے ڈھلا ہوا بچھڑا بنایا اسے پوجا اور اس کے لئے قربانی ذبح کر کے کہا اے اسرائیل یہ تمہارا معبود

ہے۔ پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ ایک گردن کش قوم ہے اب تو مجھ کو چھوڑ کہ میرا غضب ان پر بھڑکے۔ اور میں ان کو بھسم کروں۔ میں تجھ سے ایک بڑی قوم بناؤں گا موسیٰ نے اپنے خداوند کے آگے منت کر کے کہا کہ اے خداوند کیوں تیرا غضب اپنے لوگوں پر جنہیں تو شہ زوری درزبردستی کے ساتھ ملک مصر سے نکال لایا بھڑکتا ہے..... تب خداوند اس بدی سے جو اس نے سونچا تھا۔ کہ اپنے لوگوں سے کرے پچھتایا۔ موسیٰ پھر کر پہاڑ سے اتر گیا۔ شہادت کی دونوں لوحیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ جو لکھا ہوا سو خدا کا لکھا ہوا اور ان پر کندہ کیا ہوا تھا۔ جب یشوع نے لوگوں کی آواز جو پکار رہے تھے۔ سنی تو موسیٰ سے کہا کہ لشکر گاہ میں لڑائی کی آواز ہے موسیٰ بولا "یہ تو نہ فتح کے شور کی آواز نہ شکست کے شور کی آواز ہے بلکہ گانے کی آواز میں سنتا ہوں" جب وہ لشکر گاہ کے پاس آیا اور بچھڑا اور ناچ راگ دیکھا تب موسیٰ کا غضب بھڑکا اس نے لوحیں اپنے ہاتھوں سے پھینکدیں۔ پہاڑ کے نیچے توڑ ڈالیں۔ اس بچھڑے کو جسے انہوں نے بنایا تھا لیا۔ اس کو آگ سے جلایا۔ پیس کر خاک سا بنایا۔ اور اس کو پانی پر چھڑک کر بنی اسرائیل کو پلایا۔ موسیٰ نے ہارون سے کہا کہ ان لوگوں نے تجھ سے کیا کیا کہ تو ان پر ایسا بڑا گناہ لایا۔ ہارون نے کہا کہ میرے خداوند کا غضب نہ بھڑکے۔ تو اس قوم کو جانتا ہے کہ بدی کی طرف مائل ہے۔ سو انہوں نے مجھے کہا کہ ہمارے لئے ایک معبود بنا جو ہمارے آگے چلے کہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے چھڑا لایا ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا تب میں نے انہیں کہا کہ جس کے پاس سونا ہو وہ اتار لائے۔ انہوں نے مجھے دیا اور میں نے اسے آگ میں ڈالا سو یہ بچھڑا نکلا۔ جب موسیٰ نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ بے قید ہو گئے۔ کہ ہارون نے انہیں ان کے مخالفوں کے روبرو اُن کی رسوائی کے لئے بے قید کر دیا تھا۔ تب موسیٰ لشکر گاہ کے دروازے پر کھڑا ہوا اور کہا جو خداوند کی طرف ہو وہ میرے پاس آئے۔ تب سب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہوئے۔ اس نے انہیں کہا کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر مرد اپنی کمر پہ تلوار باندھے۔ ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک تمام لشکر گاہ میں گذرتے پھرو۔ ہر مرد تم میں سے اپنے بھائی کو اور ہر ایک آدمی اپنے دوست کو اور ہر ایک شخص

اپنے عزیز قریب کو قتل کرے۔ بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے موافق کیا۔ چنانچہ اس دن لوگوں میں سے قریب تین ہزار کے مارے پڑے ۔ ۔ ۔ ۔ دوسرے دن صبح کو یوں ہوا کہ موسیٰ نے لوگوں سے کہا کہ تم نے بڑا گناہ کیا۔ اب میں خداوند کے پاس اوپر جاتا ہوں۔ شاید میں تمہارے گناہ کا کفارہ کردوں۔ خداوند نے ان کے بچھڑے بنانے کے سبب سے جسے ہارون نے بنایا تھا۔ لوگوں پر طاعون بھیجا۔[۵۱]

(۶)

توراۃ کا افسانہ اگر صحیح ہے تو اس کے لازمی نتائج یہ ہوں گے :۔

الف : بچھڑے کا بنانے والا سامری نہ تھا۔ خود حضرت ہارون اس کے بنانے والے تھے۔

(ب) ہارون کو خدا نے مقدس بنایا تھا۔ تقدس کا خلعت دیا تھا۔ روحانی نعمتیں عنایت کی تھیں نسلاً بعد نسل ان کے خاندان میں اس تقدس کو قائم رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ کو ان کے (یعنی ہارون کے) اور ان کی اولاد کے متعلق بہت سی وصیتیں کی تھیں[۵۲]۔ بایں ہمہ نہ تو ہارون نے خدا کی رحمتوں کا خیال کیا اور نہ اپنے فرائض پر نظر کی۔ حضرت موسیٰؑ نے انہیں اپنا قائم مقام مقرر کیا تھا۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ عوام کو گمراہی سے بچاتے خود ہی اس کی بنیاد قائم کر دی۔

(ج) لازم تو یہ تھا کہ بنی اسرائیل پر خدا نے جس قدر عذاب نازل کیا تھا اس سے بہت زیادہ عذاب ہارون پر نازل ہوتا۔ اس لئے کہ یہی حضرت اس گمراہی کے بانی تھے۔ لیکن بیچارے عامیوں سے تو اتنا سخت بدلا لیا گیا کہ سب لوگ اپنے عزیز ترین دوستوں اور رشتہ داروں کو قتل کرنے اور کٹ

---

[۵۱] خروج باب ۳۲۔ آیت اوّل لغایۃ ۳۵!

[۵۲] خروج باب ۲۸۔ از اوّل تا آخر۔

مرنے پر مجبور کئے گئے مگر ہارونؑ کا بال تک بیکا نہ ہوا اور مواخذہ تو درکنار خدا کی جانب سے انہیں تنبیہ بھی نہیں کی گئی!

(د) توراۃ کے بیانات قابل تسلیم نہیں ہیں اس لئے کہ جا بجا ہارونؑ کی عظمت بھی بیان کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ عظمت ہارون کے خاندان میں قائم رہے گی۔ اور پھر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ خدائے اسرائیل نے بنی اسرائیل کی ہدایت و اصلاح کے متعلق ان پر جو اعتماد کیا تھا وہ حق بجانب نہ تھا۔ کیونکہ ایک وقت میں انہوں نے حد درجہ کی شرک و گمراہی میں حصہ لیا تھا۔ خود بھی گمراہ ہوئے تھے۔ اور تمام قوم کو بھی ضلالت میں پھنسایا تھا۔

یہ وہ نتائج ہیں جن سے ممکن ہے کہ سرسری نظر والی خوش اعتقاد طبیعتوں میں کوئی تذبذب نہ پیدا ہو لیکن حقیقت شناسی کا وجود اگر دنیا میں باقی ہے تو ہارونؑ کی عزت۔ توراۃ کی سچائی خدا کی خدائی۔ ان سب میں کوئی چیز بھی الزام سے بری نہیں ہو سکتی۔ اس حالت میں دو ہی صورتیں تھیں۔

(الف) توراۃ کو سچ مانتے ہیں تو خدائے بنی اسرائیل کی کبریائی اور ہارونؑ کی عزت میں فرق آتا ہے۔

(ب) خدا کی کبریائی اور ہارون کی عزت پر نظر پڑتی ہے تو توراۃ کا بیان غلط معلوم ہوتا ہے

اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں ان میں اکثر کا فیصلہ قرآن کریم سے ہو جاتا ہے۔ سورۂ نمل میں نہایت بلند آواز سے اس دعویٰ کی منادی کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ـ وَاِنَّهٗ	بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل کی اکثر باتوں کی حقیقت واقعی، کو جن میں، اختلاف کرتے ہیں۔ ان پر ظاہر کرتا

لَهُدًى وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۔ اِنَّ رَبَّكَ يَقۡضِىۡ بَيۡنَهُمۡ بِحُكۡمِهٖ‌ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡعَلِيۡمُ ۔
(جزو ۲۰ سورہ سورہ ۲۷ ۔ آیت ۷)

ہے اور بے شک یہ (قرآن) ایمان والوں کے حق میں لازسر تاپا ہدایت و رحمت ہے۔ (اے پیغمبر) کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار (قرآن کو نازل کرکے) اپنے حکم سے ان کے آپس کے اختلافات) کا فیصلہ فرماتا ہے۔ اور وہ زبردست اور سب کچھ جانتا ہے۔

یہ دعویٰ تھا اور اس کی دلیل یہی گوسالہ سامری کا واقعہ ہے، قرآن کریم نے صاف بتا دیا کہ موجودہ تورات میں یہودیوں نے اس واقعہ کو غلط پیرایہ میں درج کر دیا ہے ہارونؑ جیسے عظمت وشان کے بزرگ کا یہ شیوہ نہ تھا کہ وہ گوسالہ بنا کر پوجتے۔ اور خلق کو گمراہ کرتے ۔یہ تو سامری کا کام تھا۔

(۷)

توراۃ کی اصلاح وتصحیح کرنے والوں کو ہارون کے متعلق غلط فہمی پیدا ہونے کے غالباً دو سبب ہوئے ہوں گے :۔

(الف) کوہ طور پر جاتے وقت حضرت موسیٰ اپنے بھائی ہارون کو بنی اسرائیل کا محافظ مقرر کر گئے تھے محافظ کے لئے عبرانی زبان میں سامر یا شامر کا لفظ استعمال ہوا کرتا ہے مصلحین و مترجمین توراۃ نے جب "سامری" کا قصہ پڑھا ہو گا تو وہ سمجھے ہوں گے کہ یہ کسی شخص کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس سے وہ شخص مراد ہے جو بنی اسرائیل کا محافظ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ محافظت کی خدمت ہارونؑ ہی کو تفویض ہوئی تھی،

(ب) حضرت موسیٰؑ جب کوہ طور سے واپس آئے تو انہوں نے ہارونؑ کو بڑی سختی سے ملامت کی کہ تم نے اپنے فرض میں کس لئے کوتاہی جائز رکھی اور لوگوں کو گمراہ ہونے دیا ظاہر ہے کہ یہ ملامت صرف ان کے فرائض محافظت پر مبنی تھی اسی طرح جیسے کہ سرکار عالی کی جانب سے عوام کی بدعنوانیوں کی پرسش قوم کے سرگروہوں سے کی جاتی ہے لیکن یہودی مصححین یہ دیکھ کر کہ توراۃ میں حضرت موسیٰ کا لہجہ ہارون کی نسبت نہایت سخت اور ملامت آمیز ہے یہ سمجھے کہ ہارونؑ ہی نے وہ بچھڑا بنایا تھا۔"

یہ روداد ہے ان واقعات کی جن میں کئی ہزار برس سے اختلاف چلا آتا ہے۔ ناظرین کو اختیار ہے کہ قرآن کریم کے فیصلہ کو صحیح مانیں یا توراۃ کی غلطیوں پر جمے رہیں۔

(۸)

سامری کو حضرت موسیٰ نے جن الفاظ میں بددعا دی تھی وہ یہ تھے۔

فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَن تَقُولَ لَا مِسَاسَ۔ چل دور ہو۔ اس زندگی میں تیری یہ سزا ہے کہ (زندگی بھر) کہتا پھرے کہ (دیکھو مجھے کوئی) چھو نہ جانا ورنہ ہم دونوں کو تپ آجائے گی)۔

یہ ترجمہ مفسرین کی عام روایت کے مطابق ہے اور لا مساس کے لفظ نے اس کی بنیاد ڈالی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ لا مساس کے معنی ملنے جلنے سے ممانعت کے ہیں۔ سامری کی ضلالت دیکھ کر حضرت موسیٰ نے اس کو منع کر دیا تھا کہ خبردار! اب زندگی بھر کسی سے نہ ملنا جلنا[1] کیونکہ ظاہر ہے کہ گمراہی کا مرض اسی صورت میں متعدی ہوا کرتا ہے۔ تپ کے آنے نہ آنے سے نہ اس کو کوئی تعلق ہے نہ قرآن کریم اس قصہ کا مؤید ہے۔ اور نہ صحیح تاریخی روائتیں اس کی حامی ہیں۔ ذٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ۔

---

[1] تفسیر کبیر۔ جلد ۶ صفحہ ۶۹ (درجۂ ثانی)

کلام القرآن

(از مولانا الحاج ابوالخیر محمد خیر اللہ صاحب سنوسی القادری ورنگل)

قرآن کریم کو بہر نوع مسلمانوں کے دلوں میں اتار دینا جب ہمارا مقصود ہے تو اپنے اردو لٹریچر سے بھی اس سلسلہ میں کام لینا ضروری ہے لٹریچر کو دل و دماغ کی تربیت اور جذبات کی آفرینش میں جو خصوصیت حاصل ہے وہ محتاج تصریح نہیں۔ آج اردو تحریرات اور بول چال میں کتنے انگریزی الفاظ ہیں جو دخیل ہو کر اپنی قوت نفوذ سے نہ صرف انگریزی داں بلکہ عام جہلا کی زبانوں پر بھی چڑھ گئے ہیں ان جاہل زبانوں سے ان کا استعمال یہ بتاتا ہے کہ وہ ان کے معنی و مطلب کو سمجھ کر ہی موزون و مناسب مواقع پر ان کو برت رہے ہیں حالانکہ انگریزی کی ہوا بھی ان کو نہیں لگی۔ غرض کہ زبان کے الفاظ کا زبان زد عوام ہو جانا بھی ناواقفوں کو اس کے معنی و مطلب سے خواہ مخواہ واقف بنا دیتا ہے۔

اس لحاظ سے میری رائے یہ ہے کہ قرآن مجید کے بعض مرکب الفاظ اور چھوٹے چھوٹے فقروں کو ہم اردو میں استعمال کرنا شروع کر دیں اور روزمرہ کی موزونیت و مناسبت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے فقرے کلام پاک سے چن کر "پیغام حق" میں شائع کرتے رہیں۔ اس طریقہ کو سلف نے بھی اپنی فارسی تحریرات و تصنیفات میں ملحوظ رکھا ہے۔ آج بھی کلام پاک کے بعض فقرے جو اردو میں مستعمل ہو گئے ہیں یہ انہیں کا فیضان ہے۔

مولانا ابوالکلام نے بھی الہلال و البلاغ میں اس موزون مقصد اشاعت قرآن کو نہایت تزک و احتشام و شاندار اہتمام کے ساتھ جاری رکھا تھا جس سے اُردو کا اثر و نفوذ بھی اپنے دم خم دکھانے لگا اور شوکت کلام نے مولانا کو سارے ہندوستان میں فی الواقع اسم بامسمیٰ تسلیم کرا دیا۔ غرض ہماری

اس سعی عمل سے قرآن اور اُردو دونوں کی خدمت ہو جائے گی اسی فکر د تردد میں خیال کا اس طرف منتقل ہو جانا تھا کہ آج صبح کی تلاوت میں میں نے مختلف مقامات سے بعض ایسے الفاظ اور فقروں کو منتخب کر لیا ہے اور ناظرینؔ "پیغام حق" کے ملاحظہ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں ۔اس ذوق سخن سے وہ لوگ بہت زیادہ محفوظ ہوں گے ۔جنہوں نے اہل حرمین شریفین کو اپنی گفتگو د محاورہ میں اس طرح سے قرآن پاک کو استعمال کرتے دیکھا اور سنا ہے ۔

بازار مکہ میں ایک عرب سائل نے کچھ مانگا، اس کو جو کچھ اُس وقت دیا جا سکتا تھا دیا گیا ۔مگر اس نے کچھ زیادہ حاصل کرنا چاہا اور کہا اُدْخُلْ یَدَكَ فِی جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَاءَ یعنی جیب (گریبان نہیں کیسہ) میں ہاتھ ڈالو تو سفید سفید (روپے) نکل آئیں گے ۔میں نے بھی قرآن حکیم ہی سے فوراً جو اس وقت یاد آگیا یہ جواب دیا ۔خُذْ مَا اٰتَیْتُكَ وَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِیْنَ لے کو جو کچھ دیا گیا ہے اور خدا کا شکر ادا کرو ۔اس سے وہ بہت محفوظ ہو کر میرا پتہ پوچھتا ہوا روانہ ہو گیا ۔(یہ دونوں فقرے موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں مذکور ہیں) ایک روایت جناب رابعہ بصریہؒ کے کلام القرآن کی نسبت بھی اسی طرح مشہور ہے ۔

۱۔ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی	کہیں انسان کو من مانی مراد بھی ملی ہے ۔
۲۔ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ	یہ لوگ تو بس گمان پر چلتے ہیں ۔
۳۔ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ	وہ توزی اٹکلیں دوڑاتے ہیں ۔
۴۔ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ	کیا تم بہرں کو سنا سکتے ہو ۔
۵۔ مَا لَكُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ	تم کو کچھ اس کا علم نہیں ہے
۶۔ زُیِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ	اُس کو اپنے بُرے کام اچھے معلوم ہونے لگے ہیں ۔
۷۔ یَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ	جانوروں کی طرح یہ بھی کھاتے پیتے ہیں ۔

۸۔ تَعْسًا لَّھُمْ	اِن کا بُرا ہو (ان کا ستیاناس ہو)
۹۔ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا	اس نے ابھی ابھی کیا کہا۔
۱۰۔ اٰتِنَا غَدَاءَنَا	ہمارا ناشتہ لاؤ۔
۱۱۔ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ	ایسے یہی تو ہم چاہتے ہیں۔
۱۲۔ لَا رَيْبَ فِيْهِ	اس میں کوئی شک نہیں ہے۔
۱۳۔ شَیْءٌ عُجَاب۔	بڑی عجیب بات ہے۔
۱۴۔ شَیْءٌ یُّرَادُ	غرض و مطلب کی بات ہے۔
۱۵۔ اِنْ ھٰذَا اِلَّا اخْتِلَاقٌ۔	یہ تو ان کی من گھڑت ہے۔
۱۶۔ عَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ۔	مجھ کو اس نے باتوں میں دبا لیا۔
۱۷۔ حَسْبِیَ اللّٰہ	میرے لئے خدا کافی ہے۔
۱۸۔ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ	میں نے خدا پر بھروسہ کر لیا ہے۔
۱۹۔ فَاَصْبَحَ یُقَلِّبُ کَفَّیْهِ۔	وہ اپنے دونوں ہاتھ ملتا رہ گیا۔
۲۰۔ تَحْسَبُھُمْ اَیْقَاظًا وَّھُمْ رُقُوْدٌ	تم سمجھتے ہو کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سو رہے ہیں۔
۲۱۔ لَتَعْرِفَنَّھُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ	تم ان کو ان کے طرز کلام سے ضرور پہچان لوگے۔
۲۲۔ لَعَرَفْتَھُمْ بِسِیْمٰھُمْ	ان کو تو تم ان کی صورت ہی سے پہچان جاؤ گے
۲۳۔ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ	کیا خدا اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے؟
۲۴۔ اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ۔	میں اپنے معاملہ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔
۲۵۔ بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِ۔	صبح اور شام۔

سلسلۂ مطبوعات اقبال اکیڈمی

۱- یاد اقبال

علامہ اقبال کی وفات پر ہندوستان کے جلیل القدر شعراء نے مرحوم کو جو خراج تحسین ادا کیا تھا اسے ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب میں یہ ایک گرانمایہ اضافہ ہے۔

قیمت ۱/۴/-

۲- حیات مفتی محمد عبدہ

علامہ جمال الدین افغانی کے شاگرد رشید اور دست راست مفتی محمد عبدہ مصری کے حالات زندگی اور شاندار کارناموں کی تفصیل۔ اردو زبان میں اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔

قیمت ۰/۱۲/-

۳- تعلیمات اقبال

علامہ اقبال نے اپنی قوم کو جن باتوں کی تلقین کی ہے انکوایک مجموعہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب در اصل علامہ کی تمام کتابوں کا نچوڑ اور تشریح ہے۔

قیمت ۱/۰/۰

۴- شرح اسرار خودی

علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کو سمجھے بغیر علامہ کے کلام کو سمجھنا از حد مشکل ہے علامہ نے اس فلسفہ کو مثنوی اسرار خودی میں پیش کیا ہے۔ فارسی زبان اور فلسفیانہ انداز میں ہونے کی وجہ سے یہ کتاب عوام کی دسترس سے بہت دور تھی۔ اس شرح کے مطالعہ سے فلسفۂ خودی کے دقیق سے دقیق مسائل آپ کے لئے بالکل آسان ہو جائینگے۔

قیمت ۱/۰/۰

ملنے کا پتہ

دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ۔ لاہور

سرفراز سرور قی پرنٹنگ پریس نبل روڈ لاہور میں طبع ہوا